آنکھ مچولی

کراچی

ستمبر سنہ ۱۹۹۲ء

قیمتی کیمرہ مُفت

تفصیلات صفحہ ۳ پر

سیرت النبیؐ

پر معلوماتی تحریریں

آنکھ مچولی پھر بازی لے گیا

تقسیم انعامات کا آنکھوں دیکھا حال

اولمپکس گیم۔ کون سے تمغے کس کو ملے

بلو اور پپو کی رنگین تصویری کہانی

جب قوم ناقابلِ تسخیر دیوار بن گئی

یوم دفاع کے حوالے سے کہانیاں، نظمیں

دو حیرت ناک تصویریں

جنہیں دیکھ کر آپ دانتوں

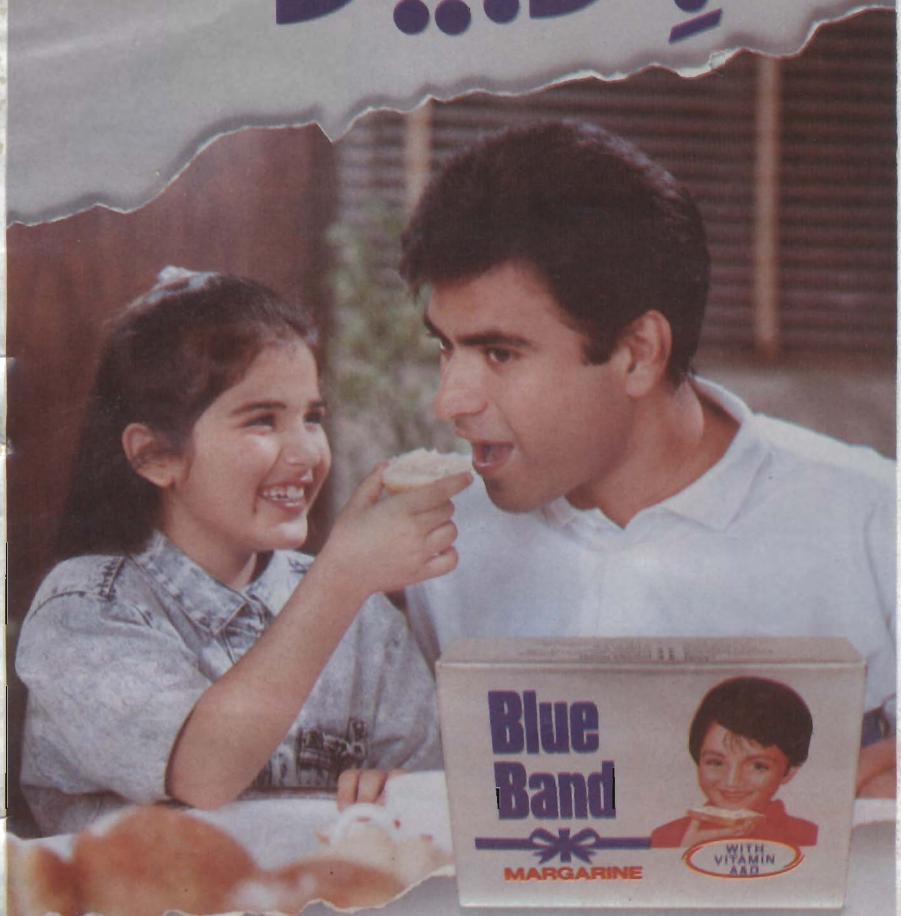

نیا
بلو بینڈ
مارجرین
Blue Band
MARGARINE
WITH VITAMIN AAD
لذّت کے ساتھ... صحت بھی!

قسمت کس کی اچھی ہے ؟
نصیب کس کے جاگتے ہیں !

آنکھ مچولی آپ کو ایک قیمتی کیمرہ تحفے میں دینا چاہتا ہے

قیمتی کیمرہ — وہ بھی مُفت

دیکھیں خُوش بختی کی چڑیا کس کے سر بیٹھتی ہے
کون خوش نصیب قیمتی کیمرہ حاصل کرتا ہے

ہمیں یہ مکمّل صفحہ کوپن میں اپنا نام، ولدیت، اسکول اور مکمّل پتہ لکھ کر بھجوا دیجئے
ہم آپ میں سے کسی ایک خوش نصیب ساتھی کو تحفتاً قیمتی کیمرہ دینے کا اعلان کریں گے

نام ________ ولدیت ________

عمر ________ کلاس ________ اسکول ________

پتا جہاں کیمرہ بھجوایا جائے ________

________ فون ________

ہمارا پتا :۔ ماہنامہ آنکھ مچولی ١٠۔ پی آئی بی کالونی ○ کراچی ۵

کوپن بھیجنے کی آخری تاریخ ٢٠ ستمبر ہے

نسل در نسل صحت مند اور
خوش و خرم بچے
مائیں جانتی ہیں کہ بچے اسی وقت خوش و خرم رہتے ہیں جب وہ صحت مند اور مطمئن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۱۴۰ سال سے سمجھدار مائیں اپنے بچوں کو وڈورڈ گرائپ واٹر پلا رہی ہیں۔ اس لئے ریاحی درد، ہاضمے کی خرابی یا دانت نکلتے وقت مسوڑھوں کی تکلیف میں آپ بھی اپنے بچے کو وڈورڈ گرائپ واٹر دیجیے۔ وڈورڈ گرائپ واٹر ہی بچوں کو تکلیف میں راحت پہنچاتا ہے۔
WOODWARD
بچوں کی صحت وڈورڈ کی روایت
WOODWARD

Interflow

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۷، شمارہ ۳ ربیع الاوّل / ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ ستمبر ۱۹۹۲ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیرِ اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مدیرِ مسئول

ایم اے فاروقی

مشاورت

مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیرِ اعزازی

طاہر مسعود

مجلسِ ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

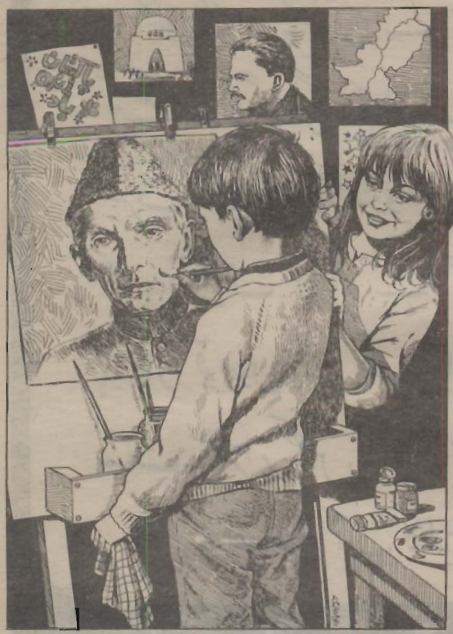

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

• ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۵۱۰- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ فون : ۷۴۰۸۰۰ — ۴۱۱۵۱۷

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

قیمت دس روپے
۷ درہم، ۷ ریال

آدابِ سفر

صفائی نصف ایمان ہے ۔ صفائی کا خیال رکھیئے ۔ ریل میں سفر کے دوران فرش پر نہ تھوکیئے ۔ پھلوں کے چھلکے ادھر ادھر پھینکنے سے گندگی پھیلتی ہے جس سے نہ صرف آپ کو بلکہ دوسرے مسافروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے صحت مند اور باوقار قوموں کی طرح اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھیں ۔ یہ ریل آپ کی ہے اس کا نقصان آپ کا اپنا نقصان ہے

پاکستان ریلوے سے تعاون کیجئے

محکمہ تعلقات عامہ

حسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے —— ادارہ — ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات —— ادارہ — ۹
نعت —— عبدالقادر — ۱۰
خدا ہمارے ساتھ ہے —— ملاحت کلیم شیروانی — ۱۱
نشانِ حیدر —— محمد اشرف — ۱۵
آنکھ مچولی اوّل آیا —— مدیحہ اعزازی — ۲۰
۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں (نظم) —— حفیظ الرحمٰن احسن — ۲۵
عظیم لڑکا —— فرزانہ روحی — ۲۶
قائداعظم کے آخری لمحات —— آر، ایم ستارہ — ۳۲
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا —— عدیل اسلم — ۳۵
فائر کھول دو —— طاہر مسعود — ۳۸
گمنام شہید —— صبا احمد — ۴۴
نیلے کاشن کے اُس پار (نظم) —— عمارہ احمد — ۴۶
بارسلونا اولمپکس —— ضیاء الرحمٰن ضیاء — ۵۰
گڑیا —— محمد علی احمد خان — ۵۸
اللہ بچائے —— سیما صدیقی — ۶۲
انسانی جسم کیا ہے؟ —— ۶۸

گونج —— عابد سلطان — ۷۰
بندر کی بنیاد موٹی کیوں؟ —— م-الف راشد — ۷۳
وہ ٹھیک کہتا تھا —— ضیاء احمد راشد — ۷۹
چوک کی تتلیاں —— ۸۳
شگوفے —— لطائف — ۸۴
دنیا میں کیا ہو رہا ہے —— سہیل احمد صدیقی — ۸۸
بخدمت جناب —— خطوں کے جواب — ۹۳
میرا شہر جو شاد ہے (نظم) —— احمد حاطب صدیقی — ۹۶
کرشمہ —— اطہر نیاز — ۹۸
پوچھو تو جانیں —— رخسانہ احمد حسین — ۱۰۵
چیزوں کی کہانی —— آصف فرخی — ۱۰۷
درِ حیرت —— ایان محمود — ۱۰۹
کشنبہ —— مجیب ظفر انوار — ۱۱۲
پاکستان کوئز —— ادارہ — ۱۱۷
حوصلوں کی جیت —— سید کاشان جمشی — ۱۱۹
قلم تلے —— نئے ادیب — ۱۲۵
ساتھی بچپن کے —— تعارف — ۱۲۷

تاریخ کے دریچے سے

○ ..... مسلمانوں کے عظیم خلیفہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب وفات پائی تو ان کے پاس صرف ایک کھردرا لباس اور پانچ دینار تھے۔

○ ..... حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیمار ہو کر گھر پر وفات پائی۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ وہ میدان جنگ میں شہید نہ ہو سکے۔ انھوں نے مرنے کے بعد کیا جائیداد چھوڑی؟ ایک غلام، ایک گھوڑا اور ایک تلوار۔

○ ..... ایک وسیع سلطنت کے حاکم اور جرنیل سلطان صلاح الدین ایوبی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس مرتے وقت کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی ہر چیز خیرات کر چکے تھے۔ ان کے کفن دفن کا انتظام بھی چندے سے ہوا۔

○ ..... مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے کفن کے لئے صرف دو روپے چار آنے چھوڑے تھے اور یہ دو روپے چار آنے انھوں نے ٹوپیاں سی کر کمائے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی تین سو روپے انھوں نے غریبوں میں بانٹنے کے لئے چھوڑے تھے۔ یہ رقم انھوں نے قرآن مجید کی کتابت کر کے حاصل کی تھی۔

ماہِ رواں کی پہلی بات

کسی بھی ملک پر دشمن دو طریقوں سے حملہ آور ہوتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پہ حملہ کر کے زمین پر قبضہ کر لیا جائے اور لوگوں کو غلام بنا لیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں کے خیالات پر قبضہ جما لیا جائے اور ان کے سوچنے اور سمجھنے کے طریقوں کو بدل دیا جائے۔ دشمن کا یہ دوسرا حملہ کسی بھی قوم کے لئے سب سے مہلک اور خطرناک ہوتا ہے۔ زمین کی سرحدوں کی حفاظت آسان کام ہے کیونکہ اس میں دشمن سامنے ہوتا ہے اور اس سے لڑنے کا جذبہ قوم کے بچے بچے میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب دشمن قوم کے لوگوں کے سوچنے سمجھنے کے طریقے ہی کو بدل دے تو پھر اس کا سدِباب مشکل ہو جاتا ہے۔

آج ہمارے ملک کو طرح طرح کے مسائل درپیش ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا مسئلہ صوبائی تعصب کا ہے۔ تعصب بہت بُری چیز ہے۔ جس ملک کے لوگوں میں تعصب پھیل جائے وہاں اتحاد اور یکجہتی کی فضا باقی نہیں رہتی۔ جس طرح گھُن لکڑی کو اور زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے اسی طرح تعصب بھی پوری قوم کو مٹا دیتا ہے کیونکہ تعصب کی وجہ سے قوم چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ اور پھر دشمن کو انھیں ختم کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ آج جو لوگ ایک پاکستانی قوم کی بات کرنے کے بجائے پنجابی، پٹھان، مہاجر اور بلوچ قوم کی باتیں کرتے ہیں وہ اس ملک کے دوست نہیں ہیں۔ وہ دشمن ہیں یا پھر دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آپ کی وطن دوستی تقاضا کرتی ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو پہچانیں اور کبھی ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ آپ کبھی بھولے سے بھی نہ سوچیں کہ "میں پنجابی، پٹھان، سندھی یا مہاجر ہوں" نہیں..... آپ صرف اور صرف مسلمان ہیں اور اس کے بعد پاکستانی ہیں۔ کیونکہ یہ ملک ہم نے پنجابی اور پٹھان یا مہاجر بن کر حاصل نہیں کیا تھا۔ اسے ہم نے ایک مسلم قوم کی حیثیت میں آزاد کرایا تھا۔ چنانچہ ہمارا ملک پاکستان اسی صورت میں ترقی کر سکتا ہے جب ہم اسے صرف مسلمانوں کا ملک سمجھیں..... دنیا بھی آپ کو اور آپ کے ملک کو اسی حوالے سے پہچانتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں آپ کی عزت اور آپ کا بھرم پاکستان ہی سے ہے۔ پاکستان نہیں تو آپ کچھ بھی نہیں۔ اور پاکستان ہے تو آپ سب کچھ ہیں۔

آپ کا دوست
ظفر محمد شیخ

نعت

عبدالقادر

رحمۃ للعٰلمیں ہیں آپؐ شاہِ دو جہاں
آپؐ کی توصیف[1] سے عاجز رہی میری زباں

آپ کی آمد سے رفعت مل گئی انسان کو
خاک کے ذرے نے پایا ہے عروجِ آسماں

تھا جہالت کا اندھیرا اس زمیں پر چار سو
آپ کی تعلیم سے روشن ہوا سارا جہاں

اپنے ہاتھوں سے تباہی لا رہا تھا ہر بشر
آپ نے سمجھا دیا انسان کو سود و[2] زیاں

عرش پر جا کر ملے رب سے شبِ معراج آپ
دو کمانوں سے برابر فاصلہ تھا درمیاں

اے رسولِ محترم، اے مظہرِ نورِ خدا
آپ نے بخشی ہے مومن کو حیاتِ جاوداں[3]

آپ کا اخلاق قرآں، آپ قرآنِ کریم
عظمتِ اخلاق کا شاہد ہے ربِ دو جہاں

آپ کا تھا اک اشارہ چاند دو ٹکڑے ہوا
معجزہ شق القمر[4] کا ہے زمانے پر عیاں

انقلاب آیا جہاں میں نغمۂ توحید سے
مٹ گیا ایمان والوں سے جہالت کا نشاں

ہے خدا کے بعد گویا آپ ہی کا مرتبہ
عرشِ اعظم ہے جہاں میں آپ ہی کا آستاں

۱۔ تعریف ، ۲۔ نفع اور نقصان ۔ ۳۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی ، ۴۔ چاند ٹکڑے ہونا

خدا ہمارے ساتھ ہے

آنحضرت کی سیرت کا
ایک پہلو جو ہماری زندگی
میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔

ملاحت کلیم شیروانی

نبوت کے اعلان کے بعد سے آنحضرتؐ اور انکے صحابہ کرام پر اہل قریش نے سختیوں اور مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ آپؐ کا راستوں سے گزرنا، نماز ادا کرنا اور روز مرہ کے دوسرے امور انجام دینا انتہائی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ کفار آپؐ کے خون کے پیاسے ہوگئے اور ایک دن آپ کو قتل کرنے کی سازش کی۔ حضورؐ کو اس دن خدا کی طرف سے مکے سے ہجرت کر کے مدینے جانے کا حکم ملا آپؐ حکم الٰہی کی تعمیل میں اپنے بستر پر اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کو سلا کر خود حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ مکے سے نکلے۔ رات گزارنے کے لئے آپؐ نے غار ثور میں پناہ لی۔ کافر آپؐ کا پیچھا کرتے ہوئے غار تک آ پہنچے قدموں کی آہٹ سن کر حضرت

ابو بکر صدیقؓ گھبرا گئے اور عرض کیا کہ "یارسول اللہ یہ لوگ ہمیں دیکھ لیں گے اب کیا ہوگا؟" آنحضرتؐ نے انتہائی سکون اور اطمینان سے ارشاد فرمایا: "گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

غزوہ اُحد کے موقع پر میدان جنگ سے واپسی پر آنحضرتؐ اور صحابہ کرام نے کچھ درختوں کی چھاؤں میں پڑاؤ کیا۔ سب لوگ اِدھر اُدھر آرام کرنے کی خاطر لیٹ گئے۔ آنحضرتؐ بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ آپؐ کے آس پاس کوئی موجود نہ تھا اور آپ کی تلوار بھی قریب کے درخت سے لٹک رہی تھی اچانک آپؐ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بدو آپ کی تلوار لئے کھڑا ہے اس نے پوچھا۔ "اے محمد بولو اب تمہیں میرے ہاتھوں سے کون بچا سکتا ہے؟ آنحضرتؐ نے انتہائی سکون اور اطمینان سے جواب دیا "اللہ"۔ یہ سننا تھا کہ بدو گھبرا گیا اسکے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر گئی اور وہ معافی مانگنے لگا۔

جنگ بدر کے موقع پر کل ۳۱۳ مسلمان تھے جن کے پاس نہ گھوڑے تھے اور نہ جنگ کا دوسرا ساز و سامان۔ وہ کفار کے ایک بڑے لشکر کے سامنے صف آرا تھے۔ کافر لڑنے کے لئے بہت تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ بظاہر کوئی مقابلہ نہ تھا خدا کا پیارا رسولؐ اپنے خدا کے سامنے سجدہ ریز تھا۔ دل خدا کی محبت سے مالامال تھا اور وہ صرف خدا سے دعاگو تھا "اے اللہ اپنا وعدہ پورا کر اور مسلمانوں کو فتح نصیب فرما۔" تاریخ گواہ ہے کہ خدا کی تائید کے بل بوتے پر کس طرح ان ۳۱۳ مسلمانوں نے ایک بہت بڑے لشکرِ کفار کو شکست دی۔

ساتھیو! یقیناً ہر اچھے مسلمان کی طرح آنحضرتؐ کی حیات پاک کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آپؐ کی حدیث (آپ کا قول یا بیان) اور سُنّت (آپؐ کا ادا کیا ہوا ہر عمل) کی پیروی کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ آنحضرت کی پوری زندگی رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لئے ایک نمونہ ہے ہم سب مانتے ہیں کہ ہمارے پیارے نبیؐ عدل و انصاف، رحمت و شفقت، مستقل مزاجی، دیانتداری اور راست بازی، عاجزی و انکساری، سخاوت و فیاضی غرض یہ کہ دنیا کی بہترین انسانی صفات کا مجسم نمونہ تھے۔ آپؐ دونوں جہانوں کے سردار تھے لیکن دنیا کی تمام نعمتیں تمام آسائشیں اور آرام، سب آپؐ کی نظر میں بے وقعت تھے کیونکہ آپؐ نے اپنے ہر عمل کو ایک احساس ایک یقین پر قائم کیا تھا کہ خدا مالک و مختار ہے، وہ اپنے بندوں سے کئے ہوئے وعدے پورے کرتا ہے، مصیبت اور پریشانی میں کوئی کام نہیں آتا سوائے خدا کی ذات کے۔

جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان سے اندازہ

ہوتا ہے کس طرح کٹھن سے کٹھن وقت میں خدا کے رسول ؐ نے صرف خدا کو ہی پکارا، کسی دنیاوی طاقت یا ذریعے کا سہارا نہیں ڈھونڈا، کسی دباؤ یا ظلم سے تنگ آکر حق کے راستے کو نہیں چھوڑا۔ اور صرف خدا پر یقین اور بھروسے کے سہارے دنیا میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ انقلاب برپا کیا کہ آج تک عقل حیران ہے۔

یہ یقین اور خدا پر بھروسہ ایمان کامل کے نتیجے میں ہی پیدا کیا جا سکتا ہے خدا کی عبادت بندے کو خدا سے قریب کرتی ہے۔ آنحضرت ؐ کا معمول تھا کہ آپ ؐ راتوں کو دیر تک عبادت کیا کرتے تھے۔ نماز میں آپ ؐ کے خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ ہجرت سے قبل جب آپ ؐ مکے میں نماز ادا کرنے کھڑے ہوتے تو کفار آپ کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتے، آپ ؐ سجدہ میں جاتے تو گندی چیزیں، کوڑا کرکٹ آپ ؐ کی پشت پر لاد دیتے لیکن آپ ؐ اسی انہماک سے نماز ادا کرتے رہتے۔ آپ ؐ خدا کی محبت میں اتنی دیر نماز میں کھڑے رہتے کہ آپ ؐ کے پیر سوج جاتے آپ ؐ اکثر نماز میں جو دعائیں مانگا کرتے تھے ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خدا پر آپ ؐ کا یقین اور بھروسہ دنیا کے ہر جذبے پر حاوی تھا آپ ؐ اکثر یہ دعا پڑھتے،

"اے اللہ میں تیرے لئے اسلام لایا، تجھ پر ایمان لایا! تجھ پر ہی میں نے بھروسہ کیا، تیری ہی جانب میں نے رجوع کیا، لوگوں سے دشمنی اور محبت تیرے لئے ہی کی، میرے اگلے پچھلے گناہ بخش دے، تو ہی سب سے پہلے اور تو ہی سب سے آخر ہے، تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں، تمام قوت اور طاقت کا مالک اے اللہ صرف تو ہی ہے۔"

ساتھیو! غور کیجئے کہ ہمارے پیارے رسول ؐ جن کی پیروی ہم سب کا فرض ہے اپنے ہر عمل کو صرف خدا کی مرضی کے مطابق ادا کرتے تھے، آپ ؐ نے کسی شخص سے ذاتی طور پر محبت کی اور نہ دشمنی۔ اپنے ہر رشتے کو صرف خدا کی مرضی کے مطابق رکھا، دنیا میں کسی سے کوئی مدد طلب نہیں کی۔ صرف خدا پر بھروسہ کیا۔ خود ؐ انقلاب اسلام کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں کے سردار تھے، آپ ؐ جس چیز کی خواہش کرتے آپ ؐ کے جانثار ساتھی آپکے قدموں میں ڈھیر کر دیتے لیکن آپ کھردری چٹائی پر آرام فرماتے۔ اکثر

پردے کی اہمیت

○ ..... اُمِ سلمہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ میں اور حارث کی بیٹی میمونہ دونوں رسول ؐ خدا کے پاس بیٹھی تھیں کہ ابن مکتوم کا بیٹا آگیا۔

آپ ؐ نے فرمایا کہ پردہ کر لو۔ ہم نے کہا وہ تو نابینا ہیں، ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ آپ ؐ نے فرمایا، کیا تم بھی نابینا ہو اور اسے دیکھ نہیں سکتیں۔

مرسلہ ..... عمران سہیل بوبی او کاڑہ۔

فاقے کرنے پڑتے، خود ؐ اپنے ہاتھوں سے محنت مزدوری کر کے اپنی ضروریات زندگی پوری کرتے لیکن دنیا کی تمام عیش و آرام کو اس لئے قابل اعتناء نہ سمجھتے کہ خدا کی محبت ان سب چیزوں پر بھاری تھی اور خدا کو سادگی پسند ہے۔

آپ اگر اپنے اردگرد نظر ڈالیں خود اپنے دن اور رات پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہماری اکثر پریشانیاں اور الجھنیں اسی بات کا نتیجہ ہیں کہ ہم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں درحقیقت جس احساس سے محروم ہو چکے ہیں وہ ہے "خدا کی ذات پر یقین اور بھروسہ۔" مثلاً یہی دیکھئے کہ ہم کسی امتحان کی تیاری کرتے ہیں تو خود پر بھروسہ کرنے کے بجائے ان واہموں کا شکار رہتے ہیں کہ دوسرے نقل کر کے پاس ہو جائیں گے لہٰذا ہم بھی نقل کرلیں یا اپنے کسی جاننے والے کی مدد سے اہم سوال معلوم کرلیں یا نمبر بڑھوالیں۔ ہم کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں تو اس لئے کہ وہ بھی جواب میں ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے گا ہم دوسروں کی مدد اس لئے نہیں کرتے کہ خدا کی رضا اور خوشی اس میں ہے۔ اگر ہمیں کوئی اختیار یا عہدہ مل جاتا ہے تو ہم بجائے اس کے کہ خدا کے شکر گزار ہوں، اپنے مزاج میں عاجزی و انکساری پیدا کریں، غرور کا شکار ہو جاتے ہیں، اپنے اختیار کے بل بوتے پر خود فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنے ماتحتوں اور اپنے سے کمزور لوگوں کو ستاتے ہیں۔ جب کہ ہمارے پیارے رسول ؐ نے کس طرح اپنے ایک صحابی ؓ کو اس ظلم سے منع کیا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے

ایک دفعہ حضرت ابو مسعود انصاری ؓ اپنے ایک غلام کو مار رہے تھے۔ آنحضرت ؐ کا وہاں سے گزر ہوا آپ نے آواز دی "ابو مسعود تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے اس سے زیادہ اللہ کو تم پر اختیار ہے۔" ابو مسعود ؓ نے فوراً عرض کیا "یارسول اللہ میں نے اس غلام کو خدا کے لئے آزاد کیا" حضور نے فرمایا "اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں چھو لیتی۔"

اگر ہماری روزمرہ کی زندگی میں کوئی الجھن یا پریشانی پیدا ہو جاتی ہے تو بجائے خدا سے مدد مانگنے اور صبر و سکون سے اس وقت کو گزارنے کے دوسروں کو اپنی تکلیف اور الجھن کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غصے اور چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گھبرا کے ایسے راستے اختیار کرتے ہیں جو ہمیں خدا سے دور کرتے ہیں۔

جب کہ ہمارے پیارے نبی ؐ نے ہمیشہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کیا۔ جن لوگوں نے آپ ؐ کے لئے مصائب کھڑے کئے، آپ ؐ پر ظلم کئے انکے حق میں بھی دعا کی۔

تو ساتھیو! آؤ آج ہم عہد کریں کہ ہم اپنے پیارے نبی ؐ کی پیروی کرتے ہوئے صرف خدا کو اپنا حامی و ناصر سمجھیں گے اور اپنے پیارے نبی ؐ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے صرف خدا کے بھروسے اور یقین کو اپنا ایمان بنائیں گے۔

نشانِ حیدر

محمد اشرف

نشانِ حیدر پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے اور یہ اعزاز حضرت علی کرم اللہ وجہ کریم سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ملک و قوم کی خاطر لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔

یہ اعزاز ۲۳ مارچ ۱۹۵۰ء کو جاری ہوا۔ یہ برطانیہ کے سب سے بڑے فوجی اعزاز وکٹوریہ کراس کے برابر ہوتا ہے۔ یہ ستارے کی طرح پانچ کونے والا ہے جو توپ کی دھات یا رنگ اور تانبے کی آمیزش سے بنتا ہے۔ اس کے اوپر ایک چاند بھی ہوتا ہے جو ہیرے کا ہوتا ہے۔ اس کے فیتے کی لمبائی ڈیڑھ انچ ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے نشانِ حیدر پانے والے کا نام، مختصر حالات، آرمی نمبر، مقامِ شہادت، لفظ شہید اور شہادت کا سال و تاریخ درج ہوتے ہیں۔

اب تک یہ اعزاز مادرِ وطن کے آٹھ سپوتوں کو مل چکا ہے۔

کیپٹن محمد سرور شہید

۱۹۱۰ء میں ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں سنگھوڑی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۴۴ء میں پنجاب رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا۔ کشمیر کی لڑائی کے دوران پنجاب رجمنٹ کی دوسری بٹالین کی ایک کمپنی کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ ۲۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو وہ اوڑی سیکٹر میں دشمن کے خلاف نہایت جوانمردی سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

میجر محمد طفیل شہید

۱۹۱۴ء میں ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ انھیں ۱۹۴۳ء میں سولہ پنجاب رجمنٹ میں کمیشن ملا۔ ابتدا میں وہ کچھ عرصہ تک خود اپنی بٹالین دس میں مختلف تربیتی اور انتظامی حیثیتوں سے نمایاں انداز میں خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ عرصہ سول آرمڈ فورسز سے بھی وابستہ رہے جس کے بعد ۱۹۵۸ء میں "ایسٹ پاکستان رائفل" میں کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے تعینات ہو کر مشرقی پاکستان پہنچے۔

۱۷ اگست ۱۹۵۸ء کو لکشمی پور کے علاقے میں دشمن سے نبرد آزما ہوئے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود آخری فتح تک اپنی رجمنٹ کی قیادت کی۔ اسی دن زخموں کی تاب نہ لا کر جام شہادت نوش کیا۔

میجر راجہ عزیز بھٹی شہید

گجرات کے ایک گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۱۹۲۸ء میں ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ کمیشن حاصل کر کے پنجاب رجمنٹ میں شامل ہوئے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تعلیم و تربیت کی تکمیل پر انھیں "شمشیر اعزاز" اور "نارمن گولڈ میڈل" دونوں اعلیٰ ایوارڈ دئے گئے جو ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میجر عزیز بھٹی لاہور سیکٹر میں برکی کے مقام پر ایک کمپنی کی کمان کر رہے تھے۔ بی آر۔ بی نہر کے کنارے دشمن سے سخت ترین مقابلے میں ٹینک کا ایک گولہ براہ راست ان کے بائیں کندھے پر آکر لگا۔ اسی ضرب سے موقع پر ہی شہید ہوگئے۔

پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید

نشان حیدر پانے والوں میں سب سے کم سن تھے۔ راشد منہاس ۷ فروری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کو جب وہ ابھی زیر تربیت تھے، اپنی معمول کی پرواز کے لئے جہاز کو رن وے پہ لے جا رہے تھے کہ اچانک ایک انسٹرکٹر ہوا باز مطیع الرحمٰن کے کاک پٹ میں زبردستی گھس آیا اور راشد منہاس کو زخمی کر کے کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے کر جہاز کو فضا میں بلند کر دیا۔ غدار مطیع الرحمٰن جہاز کو انڈیا لے جانا چاہتا تھا مگر راشد منہاس نے اپنی جان پر کھیل کر جہاز کو زمین سے ٹکرا دیا۔ یوں اس نوجوان پائلٹ آفیسر نے اپنی زندگی کے عوض وطن کی عزت بچالی۔

میجر محمد اکرم شہید

۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو ضلع گجرات کے قصبے ڈنگہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کر کے فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں شامل ہوگئے۔ ۷ جولائی ۱۹۶۸ء کو وہ مشرقی پاکستان میں متعین ہوئے جہاں انھیں فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی کمان سونپی گئی۔ ۱۹۷۱ء کو جنگ کے دوران انہوں نے محاذ کے علاقے میں اپنے چند جیالے نوجوانوں کے ہمراہ اپنے سے بیسوں گنا طاقتور اور مسلح دشمن کو دو ہفتے تک پاک دھرتی سے دور رکھا۔ اور لڑتے لڑتے مادر وطن کی حفاظت میں اپنی جان دے دی۔

میجر شبیر شریف شہید

۲۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو ضلع گجرات میں کنجاہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹ اپریل ۱۹۶۴ء کو فوج میں کمیشن حاصل کیا اور فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں تعینات ہوئے۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ سلیمانکی ہیڈورکس پر کامیاب قبضے کے بعد تین دن تک دشمن کے جوابی حملوں کو بڑی پامردی سے پسپا کرتے رہے۔ اس دوران دشمن کے ٹینک کا ایک گولہ براہ راست ان پر آکر گرا۔ اور یوں یہ جانباز سپاہی شہید ہو گیا۔

سوار محمد حسین شہید

۱۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو ڈھوک پیر بخش (راولپنڈی) میں پیدا ہوئے۔ وہ ۳ ستمبر ۱۹۶۶ء کو فوج میں بھرتی ہوئے اور ڈرائیور کی تربیت حاصل کی جب ۱۹۷۱ء کی جنگ چھڑی اس وقت وہ ۲۰ لانسر کے ساتھ خدمت انجام دے رہے تھے وہ اگرچہ ڈرائیور تھے مگر انھوں نے اپنے یونٹ کے ہر معرکے میں غیر معمولی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ کتنا ہی سنگین مرحلہ کیوں نہ ہو، کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہ کوئی نہ کوئی مشین گن سنبھال لیتے اور دشمن پر آگ برسانے لگتے۔ وہ دشمن کی شدید گولہ باری کے باوجود بڑی بے باکی سے ایک ایک خندق میں جا کر اپنے سپاہیوں کو گولہ بارود پہنچاتے ان کی نشان دہی پر ہمارے جوانوں نے دشمن کے سولہ ٹینک تباہ کئے۔ اس معرکہ میں دشمن کی مشین گن کی ایک برسٹ کی زد میں آکر سوار محمد حسین نے شہادت پائی۔ وہ نشان حیدر حاصل کرنے والے پہلے سپاہی تھے۔

لانس نائیک محمد محفوظ شہید

۲۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو راولپنڈی کے ایک گاؤں پنڈ ملکاں میں پیدا ہوئے اور ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو فوج میں شامل ہوئے۔ جب ۱۹۷۱ء کی جنگ شروع ہوئی تو اس وقت لانس نائیک محمد محفوظ ۱۵ پنجاب رجمنٹ کی "اے" کمپنی سے وابستہ تھے جو واہگہ انڈی سیکٹر پر متعین تھی۔ ۱۸ دسمبر کی درمیانی شب کو اس کمپنی کو پھل کنجری نامی گاؤں پر قبضہ کرنے کی مہم کے دوران دشمن سے شدید مقابلے میں ان کی دونوں ٹانگیں زخمی ہو گئیں۔ مگر یہ خود کو گھسیٹتے ہوئے دشمن کے مورچوں میں جا گھسے اور ان کو بھاری نقصان پہنچا کر خود بھی شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔

کتنے اچھّے کتنے پیارے
اپنی زمیں کے ننھّے تارے

کیا آنکھ مچولی پر صرف آپ کا حق ہے؟

جی نہیں! ہمیں آپ کے ننّھے بہن بھائی بھی اُتنے ہی عزیز ہیں جتنے کہ آپ...

آنکھ مچولی کا دلچسپ "مقابلۂ صحت" اُن ہی کے لیے ہے۔
یہ مقابلہ ہر ماہ "ننھے تارے" کے عنوان سے پیش کیا جائے گا۔
اس میں صرف ایک سے تین سال تک کی عُمر کے بچّے حِصّہ لے سکیں گے۔
اپنے پیارے پیارے اور صحت مند بہن بھائیوں کی رنگین تصاویر جن کا سائز ۴×۶ ہو،
۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ء تک ہمیں بھجوا دیجیے اور نقد انعامات حاصل کیجیے۔

پہلا انعام ———— ۱۰۰۰ روپے
دوسرا انعام ———— ۵۰۰ روپے
تیسرا انعام ———— ۳۰۰ روپے

* یاد رکھیے، تصاویر کے ساتھ کوپن کا آنا لازمی ہے

نام .... ولدیت ....
تاریخ پیدائش .... وزن .... قد ....
پتا ....
....

* یہ مقابلہ ددورڈ پاکستان کے تعاون سے پیش کیا جارہا ہے

ننھے تارے

وُڈورڈز بے مثل مقابلہ

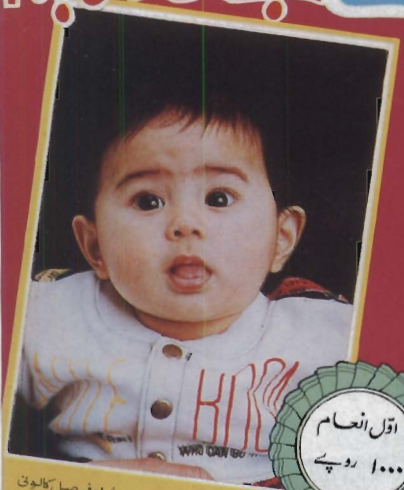

اوّل انعام
۱۰۰۰ روپے

صوفیہ عامر ـــــ شاہ فیصل کالونی

دوم انعام
۵۰۰ روپے

محمد دانش قریشی ـــ ہزارہ کالونی

سوم انعام
۳۰۰ روپے

رخسار ـــــ پشاور

خصوصی انعام
۱۰۰ روپے

اخنا طربان ـــــ لاہور

تعاون: وڈورڈز (پاکستان) لمیٹڈ

آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی، کشمیر انفارمیشن سینٹر کے ڈائریکٹر جنرل جناب الف دین ترابی سے ایوارڈ وصول کر رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ برائے بہبود اطفال یونیسف کے جناب رمضان اظہر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

مشہور شاعر جناب افتخار عارف، طاہر مسعود اور جناب الف دین ترابی

اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل جناب افتخار عارف خطاب کر رہے ہیں

آنکھ مچولی کے منیر احمد راشد جنہیں ۱۹۹۱ء کے بچوں کے بہترین نوجوان مصنف کا ایوارڈ دیا گیا۔ راشد اب تک تقریباً پچاس کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ وہ آنکھ مچولی سے فروری ۱۹۹۰ء سے وابستہ ہیں

مدیران رسائل، ماہرین تعلیم، نوجوان مصنفین اور پیارے پیارے بچے۔

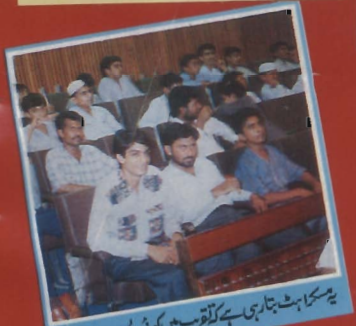

یہ سکراہٹ بتا رہی ہے کہ قریب میں کوئی دلچسپ بات ہوئی

کچھ سنتے ہوئے، کچھ اونگھتے ہوئے اور کچھ آپس میں باتیں کرتے ہوئے۔

آنکھ مچولی اول آیا واہ بھئی واہ

دعوۃ اکادمی کے سیمینار اور تقریب تقسیم انعامات کی روداد مدیر اعزازی کے قلم سے

ادھر کئی دن سے متواتر آنکھ مچولی کے ساتھیوں کے فون پہ فون آرہے تھے۔

"انکل! اس بار بھی آنکھ مچولی کو بہترین رسالے کا ایوارڈ ملنا چاہئے ورنہ......"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ میں آنکھ مچولی پڑھنا چھوڑ دوں گا۔"

"بھئی یہ تو اچھی دھمکی ہے۔"

"بس میں نے کہہ دیا۔ ہمارے رسالے کو پہلے نمبر پر آنا چاہئے۔"

ایک فون آیا...... "انکل! آپ نے میری کہانی نہیں چھاپی ہے نا...... دیکھئے گا اس بار آپ کے رسالے کو ایوارڈ نہیں ملے گا۔"

کچھ فون ایسے بھی آئے...... "آپ مٹھائی کھلانے کا وعدہ کریں تو پھر ہم آپ کے لئے دعا مانگیں گے کہ اللہ کرے آنکھ مچولی کو ایوارڈ مل جائے۔"

غرضیکہ اس طرح کی دھمکیوں اور دعاؤں کے ہجوم میں ہم دعوۃ اکادمی کی دعوت پر اسلام آباد پہنچے۔ ہر سال کی طرح اب کے بھی وہاں بچوں کے رسائل کے مدیروں کا "جمعہ بازار" لگا ہوا تھا۔

پہلے دو دن تک تو سیمینار کی گہما گہمی رہی۔ سیمینار کا موضوع تھا...... "اکیسویں صدی کے تقاضے اور بچوں کا ادب" سچی بات تو یہ ہے کہ اس سیمینار کے مقالات سن کر ہمیں پہلی بار یاد آیا کہ بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے۔ اور ایک نئی صدی سر پہ کھڑی ہے۔ سیمینار کا افتتاح ملک کے مشہور محقق اور مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جہاں بہت اچھی اچھی باتیں کیں وہاں یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ایک منصوبہ بنا رہے ہیں جس کے تحت بچوں کے لئے ایک ہزار کی تعداد میں مفید کتابیں چھاپی جائیں گی۔ اس اعلان پہ سب نے خوب تالیاں بجائیں۔ سب سے زیادہ تالیاں نوجوان ادیبوں نے بجائیں۔ (ایک رسالے کے مدیر نے ہمارے کان میں کہا تالیاں بجانے والے ادیبوں کی کتابیں سب سے پہلے چھپیں گی۔) سیمینار میں سب سے پہلا مقالہ میرزا ادیب صاحب کو پڑھنا تھا۔ میرزا صاحب اچانک بیمار پڑ گئے، خود تو نہ

مدیر "پھول" جناب اختر عباس "کشمیر نمبر" پر دوسرا انعام وصول کر رہے ہیں۔

آسکے لیکن مقالہ بھجوا دیا۔ ان کا طویل مقالہ کسی اور نے پڑھا۔ سب نے تعریف کی، تنقید کسی نے بھی نہیں کی کیونکہ مقالہ نگار کی غیر موجودگی میں تنقید، غیبت میں شمار ہوتی۔ پھر تو مقالات کا جیسے سیلاب آگیا۔ صبح مقالہ، دوپہر مقالہ، شام مقالہ، رات مقالہ، اتنے سارے مقالات کے باوجود لوگ اکتائے نہیں۔ کیونکہ ایک تو مقالوں کے موضوعات بہت اچھے تھے اور پھر مقالہ پڑھنے کے بعد اس پر دھواں دھار بحث ہوتی تھی۔ رسائل کے مدیران بحث میں الجھ پڑتے اور نوجوان ادیب انہیں الجھتا دیکھ کر خوب لطف لیتے، ایک دوسرے کے کہنیاں مارتے اور کانوں میں سرگوشی کرتے۔ شاید کہتے ہوں گے!

"دیکھو بھئی یہ بڑے بھی آپس میں بچوں کی طرح لڑتے ہیں۔"

لیکن علمی بحث میں بھی گرما گرمی تو ہوتی ہی ہے۔

جب ہم اسلام آباد پہنچے تھے تو حبس کا عجیب عالم تھا لیکن پھر بارشیں شروع ہو گئیں۔ موسم بھی خوشگوار ہو گیا۔ لہٰذا خوبصورت موسم میں آپس میں ملنے جلنے اور بحث و مباحثے میں بہت مزہ آیا۔

دوسرے دن یعنی ۳۰/ جولائی کی سہ پہر تک سیمینار ختم ہو گیا۔ اسی رات کو وہ خوفناک تقریب تھی جس کے سلسلے میں ہم بچوں کی دعائیں اور دھمکیاں سمیٹے، دھڑکتے دل کے ساتھ آئے تھے۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے وسیع اور

کشادہ ہال میں جب ہم داخل ہوئے تو پورے ہال کو بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا پایا۔ بچوں کے چہروں پہ شرارتیں ناچ رہی تھیں۔ چونکہ ہر سال بچے اپنے پسندیدہ رسائل کے مدیروں سے چبھتے ہوئے سوالات بھی کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے کئی مدیروں کے چہروں پہ ہوائیاں اڑنے کا منظر دیکھا۔ (ویسے آپس کی بات ہے تھوڑا سا پسینہ تو ہمارے ماتھے پر بھی آگیا تھا، جسے سب کی

سید کاشان جعفری۔ جنہیں دوسرا انعام ملا۔

آنکھ بچا کر ہم نے رومال سے پونچھ لیا)

اس تقریب کے مہمان خصوصی معروف شاعر اور اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل افتخار عارف تھے اور صدارت بچوں کے عالمی ادارے یونیسیف کے نمائندے رمضان اظہر کے حصے میں آئی تھی۔

ہاں..... ایک ضروری بات تو ہم بتانا بھول ہی گئے۔ تقریب میں ہمیں بتایا گیا کہ اس سال دعوہ اکادمی بچوں کے بہترین رسائل کا ایوارڈ نہیں دے رہی ہے۔

(اور ہم نے یہ سن کر خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اگر ہمیں ایوارڈ نہ ملتا تو ہم اپنے ساتھیوں کو واپس آکر کیا منہ دکھاتے۔) مدیروں نے اس پر احتجاج کیا تو بتایا گیا کہ اس سال جن رسالوں نے سب سے اچھا "کشمیر نمبر" نکالا ہے اس پہ پہلا، دوسرا، تیسرا انعام دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، نوجوان ادیبوں میں سے تین بہترین ادیبوں کو کہانیاں لکھنے پہ تین انعامات بھی دیئے جائیں گے۔

تقریب شروع ہوئی تو سب سے پہلے بچوں نے مدیروں سے سوالات کئے۔

بچوں کے سوالات ذہانت سے بھرپور تھے۔ لیکن بھئی مدیروں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ خوب تیاری سے آئے تھے۔ ہر سوال کا جواب فٹا فٹ دیا۔ سوائے ایک آدھ سوال کے۔ کیونکہ یہ سوال نہیں تھے۔ بچوں نے رسالوں کی ایسی خامیاں تلاش کی تھیں کہ انہیں سوالوں سے نہیں بلکہ رسالے پر محنت کر کے ہی دور کیا جا سکتا تھا۔ سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو "کشمیر نمبر" پہ تین بہترین رسائل کے ایوارڈ دینے کی باری آئی۔ اعلان ہوا۔

تیسرا انعام..... ماہنامہ تعلیم و تربیت (تالیاں)

دوسرا انعام..... ماہنامہ پھول (تالیاں)

ہمارا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لو بھئی آنکھ مچولی کو تو ایوارڈ ہی نہیں ملا۔ یہ تو بڑی انصافی ہے۔ ابھی ہم اس تشویش میں مبتلا ہی تھے کہ

پکارا گیا...... "اور سب سے بہترین "کشمیر نمبر" نکالنے پر آنکھ مچولی کو پہلا انعام........" (تالیاں ہی تالیاں)

دوسرے رسائل کو تو صرف کتابیں ملیں لیکن آنکھ مچولی کو کتابیں بھی ملیں اور ایک خوبصورت سی شیلڈ بھی دی گئی۔ مزے کی بات اس وقت ہوئی جب بہترین کہانیاں لکھنے پر تین نوجوان ادیبوں میں سے آنکھ مچولی کے منیر احمد راشد کو پہلا انعام دینے کا اعلان ہوا۔

دو، دو انعامات اور وہ بھی اول انعامات ملنے پر ہال میں آنکھ مچولی کی خوب واہ واہ ہوئی۔ سب نے بڑھ بڑھ کر مبارکبادیں دیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہوا کہ منیر احمد راشد اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ایوارڈ لینے کے لئے وہاں موجود نہیں تھے۔

سید کاشان جعفری جنہیں دوسرا انعام ملا تھا، وہ بھی کسی وجہ سے تقریب میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ البتہ تیسرا انعام پانے والے نوجوان ادیب اشفاق احمد نے اپنا انعام خود وصول کیا۔

جب ہم ہال سے نکلنے لگے تو ایک رسالے کے مدیر نے چپکے سے کہا...... "اچھا ہی ہوا کہ سال کے بہترین رسائل کا ایوارڈ تقسیم نہیں کیا گیا۔ ورنہ آپ اتنے سارے ایوارڈ اٹھا کے کراچی کیسے لے جاتے؟"

یہ کتابیں آپ کیا کریں گے؟

آپ امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ مبارک ہو!

اب پچھلی جماعت کی کتابوں کی آپ کو ضرورت نہیں رہی۔ آپ کے اردگرد بہت سے بچے ایسے ہیں جنہیں ان کتابوں کی ضرورت ہے۔ اور ممکن ہے کہ ان کتابوں کو خریدنے میں انہیں مالی مشکلات درپیش ہوں۔ آپ کو چاہئے کہ ایسے بچوں کو تلاش کریں اور اپنی یہ کتابیں انہیں تحفتہً پیش کردیں۔

ان کتابوں کا اس سے مفید استعمال کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس طرح ملک و قوم کی خدمت بھی ہوگی اور آپ کو سچی خوشی بھی حاصل ہوگی۔

ادارہ آنکھ مچولی

چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں

حفیظ الرحمٰن احسن

چھ ستمبر کا محبوب دن آگیا
اس کی یادوں سے دل میں اُجالا ہوا

ہے یہ قصہ ستمبر کی اک رات کا
سرحدوں کی طرف اپنا دشمن بڑھا

وہ یہ سمجھا، کہ ہے رات، ہم سوئے ہیں
خواب کی وادیوں میں کہیں کھوئے ہیں

چوری چوری بڑھا سرحدِ پاک کو
ہو سکا ہی نہ اندازہ چالاک کو

ایک ارضِ مقدس ہے یہ سرزمیں
ملک اس جیسا دنیا میں کوئی نہیں!

جو ادھر لے کے نیت بُری آئے گا
اپنی قسمت کو روتا ہوا جائے گا!

سورما جونہی دشمن کے آگے بڑھے
لپکے ان پر مجاہد بڑی شان سے

دیکھتے دیکھتے رن پڑا زور کا
بم پھٹے، ٹینک سے ٹینک ٹکرا گیا

الاماں! گرم ایسا ہوا معرکہ
دل زمین و فلک کا دہلنے لگا!

سترہ روز یہ جنگ جاری رہی
یوں لگا جیسے صدیوں پہ بھاری رہی

دشمن آیا تھا یوں تو بڑے مان سے
دُم دبا کر وہ بھاگ اٹھا میدان سے

سرخرو اپنے غازی، مجاہد ہوئے
اور شہید اونچا نامِ وطن کر گئے!

ملتِ پاک یوں ہو گئی سر بلند
اس نے سچ مچ ستاروں پہ ڈالی کمند

دین و ایماں کا پرچم جو تھا ہاتھ میں
فتح و نصرت سے حق نے نوازا ہمیں!

عزم و ہمت کی یہ داستاں...... زندہ باد!
چھ ستمبر کا پیغام ہے...... الجہاد!

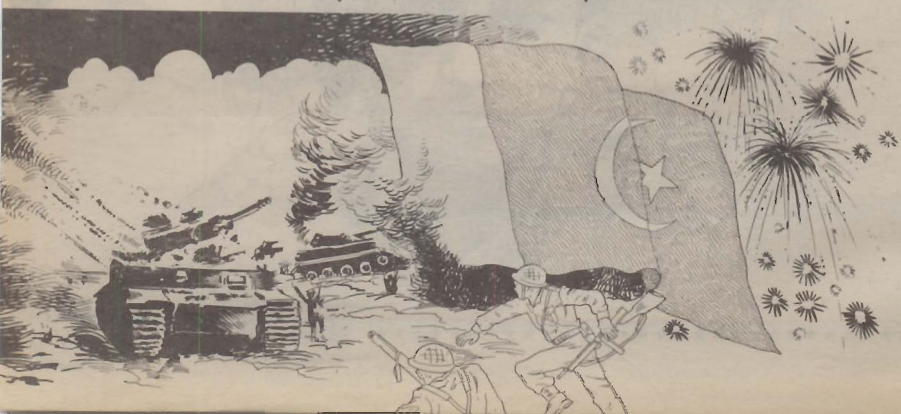

عظیم لڑکا

فرزانہ روحی

سیٹھ شرافت علی اپنی ننھی مُنی سی بیٹی ثومی کو گود میں لے کر اپنی کوٹھی کی چھت پر کھڑے تھے۔ ننھی ثومی باپ کی گود میں چڑھ کر اونچائی سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی، اتنے میں ایک کوا اپنی چونچ میں روٹی کا ٹکڑا لے کر اڑتا ہوا آیا اور دیوار پر بیٹھ گیا۔ کوّا روٹی کے ٹکڑے کو پنجوں میں دبا کر نوچ نوچ کر کھانے لگا۔ ثومی کوے کو روٹی کھاتا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی اور اسے اڑانے کے لئے اپنی توتلی زبان میں "ہپ ہپ" کرنے لگی۔

تالیوں کی آواز سن کر نیچے سے گزرتے ہوئے اجو نے اوپر دیکھا۔ پیاری پیاری، گول مٹول،

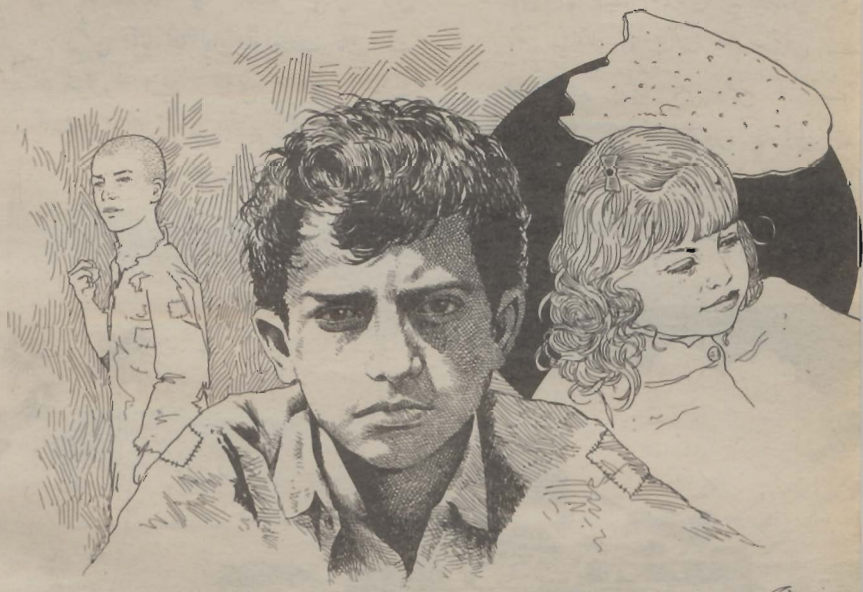

سرخ سرخ گالوں اور سنہری بالوں والی ثومی اسے بالکل کسی ننھی پری کی مانند لگی۔ اجو اسے حیرت سے دیکھنے لگا مگر جب اس کی نظر سیٹھ شرافت پر پڑی تو وہ ان کی بڑی بڑی خوفناک مونچھیں دیکھ کر سہم گیا اور وہ بھی کوے کو روٹی کھاتا ہوا دیکھنے لگا۔ جب کوے کا پیٹ بھر گیا تو وہ بچی ہوئی روٹی نیچے گرا کر اڑ گیا۔ اجو نے صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ روٹی دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا روٹی کی جانب بڑھنے لگا مگر اس سے پہلے ہی کہیں سے اس کا ہم عمر گنجا سا لڑکا دوڑتا ہوا آیا، اور روٹی اٹھا کر اس نے اجو کو فاتحانہ انداز میں دیکھا اور جلدی جلدی روٹی اپنے منہ میں ٹھونسنے لگا۔

"دے، دے..... یہ میری ہے۔ پہلے میں نے دیکھی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اجو اس پر جھپٹ پڑا۔

"چل چل..... تیری کہاں سے آگئی ..... اللہ کی زمین پر پڑی تھی۔" یہ کہتے ہوئے دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ روٹی اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری تو اجو نے جھپٹ کر اٹھالی اور تیز تیز بھاگنے لگا۔ جب اس نے بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گنجا لڑکا اسے حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اجو دوڑتے دوڑتے رک گیا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا اور روٹی اسے دیتا ہوا بولا۔ "لے کھالے تجھے زیادہ بھوک لگی ہے۔" گنجا لڑکا روٹی لے کر جلدی جلدی کھانے لگا کہ کہیں اجو دوبارہ نہ چھین لے۔ اجو آگے بڑھا۔ اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ قریب ہی پارک میں نل کھلا ہوا تھا اور ایک کتا پانی کی بہتی ہوئی دھار کو زبان سے چاٹ کر اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ اجو نے سوچا "کھانا نہیں ہے مگر پانی تو ہے اسی سے پیٹ بھر لینا چاہئے۔" پھر وہ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پینے لگا۔ پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا اس کے پیالہ نما ہتھیلیوں میں نہ سما سکا تو وہ نلکے سے منہ لگا کر پانی پینے لگا نتیجتاً وہ بھیگ گیا۔ پانی پی کر اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا پارک کے ایک کونے میں نیم کے درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا نے لوری کا سا کام کیا اور جلد ہی اسے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

جب آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ ننھے ننھے بچے ادھر ادھر دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ کوئی آرہا تھا تو کوئی جا رہا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اس نے تمام بچوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر جانے کیا سوچ کہ اپنے سراپے پر نگاہ دوڑانے لگا اور میلی کچیلی پھٹی ہوئی قمیض کو آگے سے یوں مٹھی میں پکڑ لیا۔ جیسے بٹن بند کرنا چاہتا ہو۔ اچانک ایک بچے کی نظر اس پر پڑی تو وہ سب کو بتانے لگا۔ "..... وہ دیکھو..... کون کھڑا ہے ! " دوسرا بولا "پاگل ہے پاگل ہے۔" سارے بچے اس کے ارد گرد جمع ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ ایک بچے نے دریافت کیا۔ "کیا تم مین

ہول میں گر گئے تھے؟" اس کے ساتھ ہی سب زور زور سے ہنسنے لگے۔ ایک دوسرے بچے نے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "اجو" ..... "ہاہاہا، اجو، یہ کیسا نام ہے، اجو، مجو، پھجو،" سب کورس کے انداز میں گانے لگے۔ ان کی آواز سن کر مالی وہاں آگیا، اور اس نے ان خوبصورت بچوں کے درمیان سے کالے کلوٹے اجو کو ڈانٹ کر بھگا دیا، وہ ان تمام بچوں کو جواب تک اچھل اچھل کر اس کے نام کا مذاق اڑا رہے تھے، حسرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سامنے ایک دودھ کی دکان تھی۔ بڑی سی کڑاہی میں دودھ رکھا تھا۔ ایک موٹا آدمی سب کو دودھ ناپ ناپ کر دے رہا تھا۔ اجو وہاں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا تو موٹے آدمی نے اسے دودھ سے بھرا جگ دیتے ہوئے کہا۔ "پتر! شاباش یہ دودھ سامنے کالے گیٹ والی کوٹھی میں دے آ۔" اجو نے جگ تھام لیا۔ دودھ دیکھ کر اب اس سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے جگ سے منہ لگا لیا۔ گرم گرم دودھ سے اس کا منہ جل گیا مگر اس نے کوئی پروانہ کی اور غٹاغٹ دودھ پینے لگا۔ اسی اثناء میں کالے گیٹ والی کوٹھی سے ایک بڑھیا نکلی۔ اجو نے اسے جگ پکڑا دیا۔ "ارے اتنا کم دودھ!" یہ کہتے ہوئے بڑھیا نے اجو کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹ تر تھے اور ٹھوڑی پر دودھ کا ایک قطرہ نیچے ٹپکنے کے لئے تیار تھا۔ بڑھیا اسے کان سے پکڑ کر دودھ والے کے پاس لے گئی اور بولی۔ "پہلوان جی، کیسا نوکر رکھا ہے تم نے، کمبخت آدھا دودھ تو راستے میں ہی پی گیا۔"

"کیوں بے! ..... تیرے باپ کا مال تھا، جو پی گیا۔" یہ کہتے ہوئے پہلوان نے اس پر لاتوں کی بارش کر دی۔ جب جی بھر کے مار چکا تو تھوکتے ہوئے بولا "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اٹھا کر گرم گرم دودھ کی کڑاہی میں ڈال دوں گا پھر جی بھر کے دودھ پی لیجو۔" اجو گرتا پڑتا وہاں سے بھاگا۔

سسکیاں بھرتا، آنسو پونچھتا، وہ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا بازار میں پہنچ گیا۔ ایک جانب بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ چم چم کرتی گاڑیوں میں اپنی شکل دیکھتا ہوا کولڈ ڈرنک کی دوکان کے قریب جا پہنچا۔ قہقہے کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو دکان پر چند لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان سب کے ہاتھوں میں ایک ایک بوتل اور ایک ایک چھوٹی سی تھیلی تھی جس میں سے وہ کوئی پیلی پیلی سی چیز نکال کر کھاتیں اور پھر بوتل سے منہ لگا لیتیں، اور ساتھ ہی باتیں کرتے ہوئے ہنستی جاتی تھیں۔ وہ انہیں بغور دیکھنے لگا اور سوچا "شاید یہ سب انگریز لڑکیاں ہیں کیونکہ جب بستی میں سیلاب آیا تھا جس میں اماں، بابا اور بہت سارے لوگ بہہ گئے تھے تو اور لوگوں کے ساتھ ایسی ہی عورتیں بھی آئی تھیں ان میں سے ایک نے تو مجھے بسکٹ، دودھ کا ڈبہ اور کپڑا بھی دیا تھا۔" پھر اس کی نگاہیں اس پیکٹ والی پیلی سی چیز پر جم گئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اجو کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اپنا پیکٹ دیتے

ہوئے۔ بولی "چھوٹے یہ لو تم کھالو۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پیکٹ لے لیا اور مزے سے کھانے لگا۔ "اف، کتنی مزیدار چیز ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔ یکایک ایک بڑی سے گاڑی اس کے سامنے آکر رکی اس میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص بیٹھا تھا۔ اجو کو وہ جانا پہچانا سا لگا۔ جب اس کی نظر ننھی ثومی پر پڑی تو اسے یاد آگیا کہ یہ وہی ننھی پری ہے جسے اس نے چھت پر دیکھا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ایک عورت باہر آئی اور مارکیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ کھڑکی سے ثومی باہر جھانکنے لگی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ثومی کے قریب آیا اور کھڑکی میں سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے سرخ سرخ گالوں کو چھو لیا۔ ننھی ثومی اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ثومی کو مسکراتا دیکھ کر اجو بھی خوش ہو گیا۔ اور جلدی سے چپس نکال کر اسے دینے لگا تو ثومی کے باپ نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "چلو بچہ..... جاؤ۔" اور وہ سہم کر ایک جانب ہٹ گیا۔ قریب سے گزرتے ہوئے غبارے والے کو دیکھ کر ثومی ضد کرنے لگی تو اس کے باپ نے اسے غبارہ خرید کر دیا۔ وہ دھاگہ پکڑ کر غبارے کو فضا میں اڑانے لگی تو دھاگہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا اور گیس کا غبارہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ ثومی نے جھٹ کار کا دروازہ کھولا اور "بیلون..... بیلون" چیختی ہوئی غبارے کے پیچھے پیچھے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ایک لال بس بہت تیزی سے دھواں اڑاتی چلی آرہی تھی۔ اجو نے چپس کے پیکٹ کو ایک طرف پھینکا اور ثومی کے پیچھے دوڑنے لگا اور قریب پہنچ کر .....اس نے ثومی کی فراک پکڑ کر پوری قوت سے پیچھے کی جانب کھینچ لیا۔ ثومی فٹ پاتھ پر اوندھے منہ گری اور بس اجو کو کچلتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے چاروں طرف ہجوم لگ گیا سیٹھ شرافت نے نازک سی ثومی کو جلدی سے اٹھایا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا۔ جس سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ جبکہ اجو کے کچلے ہوئے وجود سے بہنے والے خون نے سڑک پر صرف چند سرخ لکیریں کھینچی تھیں۔

اجو کی لاش پوسٹ مارٹم کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ جب اسے لاوارث قرار دے دیا گیا تو سیٹھ شرافت نے اس کی کچلی ہوئی لاش حاصل کی اور سپرد خاک کرا دیا۔ سیٹھ شرافت نے اس کا شاندار سا مقبرہ بھی بنوایا۔ اور کھانا پکوا کر غریبوں میں تقسیم کرایا۔ اجو جسے زندگی میں بھوک نے بہت تنگ کیا تھا مرنے کے بعد ایک شاندار سی قبر میں سکون سے لیٹا تھا اور اس کے نام پر بہت سے لوگ کھانا کھا رہے تھے، جن میں گنجا لڑکا بھی شامل تھا، گنجے لڑکے نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر قبرستان کی سمت چل پڑا۔ چند افراد فاتحہ پڑھ رہے تھے شاید بہت بڑے لوگ تھے، کیونکہ ساتھ ہی پولیس کی گاڑی بھی کھڑی تھی اور قبرستان سے باہر لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں جب سب جا چکے تو گنجا لڑکا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ قبر کی چاروں جانب سرخ گلاب بکھرے پڑے تھے۔ ایک کتبے پر لکھا تھا۔ "عظیم لڑکا۔" گنجے لڑکے نے کتبے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا، شاید وہ

یہ کہنا چاہتا تھا کہ "دوست! جب پہلی بار مجھے بھوک لگی تھی تو تم نے مجھے اپنی روٹی دے دی تھی اور آج بھی جب میں دو دن سے بھوکا تھا تو تمہاری وجہ سے ہی مجھے کھانا ملا اگر تم نہ مرتے تو شائد میں بھوک ۔۔سے مرجاتا۔ بے شک تم ایک عظیم لڑکے ہو۔ کسی کو بھوک سے مرنے سے بچاتے ہو اور کسی کو گاڑی۔سے دب کر مرنے سے بچاتے ہو،" اور وہ در در کی ٹھوکریں کھانے والا عظیم لڑکا جو، تمام باتوں سے بے نیاز اپنے خوبصورت سے گھر میں ہمیشہ کی نیند سویا ہوا تھا۔

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB VIP sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

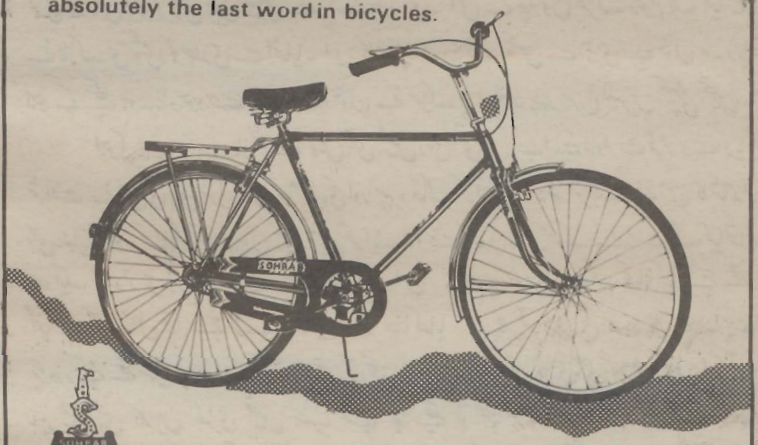

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan

خریدار بنایئے

انعام پایئے

آنکھ مچولی مُلک کا مقبول ترین رسالہ ہے۔

اس کے قارئین کی رائے میں یہ ایک بے حد مفید اور معیاری رسالہ بھی ہے۔ ادارہ آنکھ مچولی نے اس رسالے کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے آنکھ مچولی کے جو ساتھی آنکھ مچولی کے دس سالانہ خریدار بنائیں گے، اُنھیں ادارے کی جانب سے ایک ڈیجیٹیل گھڑی تحفے میں پیش کی جائے گی — دس خریدار بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، محلے اور اسکول میں ایسے دس ساتھی آپ ذرا سی کوشش سے تلاش کر سکتے ہیں۔

آگے بڑھیے

سالانہ خریدار بنایئے اور قیمتی انعام پایئے

نوٹ: اس اسکیم میں حصّہ لینے کے خواہش مند ساتھی مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھ کر اسکیم کی تفصیلات اور کوپن منگوا سکتے ہیں

ماہنامہ آنکھ مچولی ۵۔ اے پی آئی بی کالونی۔ کراچی ۵ فون ۴۱۱۵۸۷

قائداعظم کے آخری لمحات

آر۔ ایم ستارہ

قائداعظم کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر ان کے معالجین کے کہنے پر قائد کو کراچی لے بلایا گیا۔ چار بج کر پندرہ منٹ پر قائد کا جہاز ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر اترا۔ قائد کے جہاز سے اترتے ہی انہیں اس ایمبولینس میں لٹا دیا گیا جو ان کے ملٹری سیکرٹری کرنل نوئیلز لے کر آئے تھے۔ مس جناح اور نرس جو کوئٹہ سے آئی تھیں ایمبولینس میں بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر مستری اور ملٹری سیکرٹری گورنر جنرل کی کار میں بیٹھ گئے۔ ایئرپورٹ سے قائد کی قیام گاہ دس میل دور تھی ایمبولینس نے ابھی بمشکل چار میل کا سفر طے کیا ہو گا کہ انجن میں خرابی کے باعث رک گئی۔ بیس منٹ کی محنت کے بعد بھی انجن کا نقص دور نہ ہو سکا تو قائد کے ملٹری سیکرٹری دوسری ایمبولینس لینے کے لئے روانہ ہو گئے۔

ایمبولینس میں بے حد حبس تھا۔ نرس اور ملازم قائد کو پنکھا جھلنے لگے لیکن قائد کو پھر بھی پسینہ آرہا تھا اور پسینے سے ان کے کپڑے بھیگ گئے۔ پھر باہر ہوا بھی تیز چل رہی تھی اور انہیں ہوا لگ جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا۔ ان کی نبض نحیف اور بے قاعدہ ہوتی جا رہی تھی۔

آخر کار ایک اذیت ناک طویل وقفے کے بعد

دوسری ایمبولینس آن پہنچی اور قائد کو فوراً اس میں سوار کرایا گیا اس ایمبولینس پر گورنر جنرل کا جھنڈا نہیں لہرا رہا تھا۔ اس لئے کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ان کا قائد اس خطرناک حالت میں کراچی کی سڑکوں سے گزر رہا ہے۔ ایمبولینس قائد کے کمرے کے دروازے کے عین سامنے جاکر رک گئی اور انہیں اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ نرس نے ان کی حرارت دیکھی اور نبض کو محسوس کیا۔ حرارت معمولی تھی ڈاکٹر نے جب ان کا معائنہ کیا تو ان کی نبض نحیف تھی اور کچھ بے قاعدہ بھی۔ انہیں پسینہ بھی آرہا تھا۔ اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے ڈاکٹر نے انہیں مقوی قلب انجکشن لگا دیا۔

معالجین نے کہا۔ "حضور! ہم نے آپ کی تقویت کے لئے انجکشن لگایا ہے یہ فوراً اثر دکھائے گا انشاء اللہ آپ زندہ اور سلامت رہیں گے۔"

مس جناح اتنی نڈھال تھیں کہ ان سے بات تک نہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت کمرے میں فقط مس جناح ایک نرس اور تین ڈاکٹر موجود تھے۔

دس بجے قائد کی نبض کچھ بہتر ہوئی۔ لیکن دس منٹ بعد پھر نحیف ہو گئی۔ دس بج کر بیس منٹ پر نبض کلائی پر محسوس تک نہ کی جا سکتی تھی اور جب ڈاکٹر نے حرکت قلب معلوم کرنے کا آلہ لگایا تو حرکت بند تھی۔ عظیم قائد اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ تاریخ تھی گیارہ ستمبر اور سال تھا ۱۹۴۸ء۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

دو چہروں والا آدمی

چن دنیا کا عجیب و غریب آدمی ہے۔ اس کے دو چہرے ہیں۔ دوسرا چہرہ، پہلے چہرے کے رخساروں سے نمودار ہو رہا ہے۔ دوسرے سر کے بالوں نے پہلے چہرے کی آنکھوں کو ڈھانپ رکھا ہے جبکہ اس کا دوسرا منہ اس کے کان کے پاس ہے۔ آپ کھلے ہوئے منہ سے جھانکنے والے دانتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

عدیل اسلم

کسی بھی ملک کے دفاع میں فضائی قوت کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور آج کے دور میں تو فضائی قوت کے بغیر فوج کا تصور ہی ناممکن ہے۔ پاکستان میں فضائی قوت کو مزید ترقی دینے کے لئے کئی پروگراموں پر عملدر آمد جاری ہے اور ایک خوش آئند امر تو یہ ہے کہ اب پاکستان دفاعی ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مستقبل میں ہم اسلحہ سازی کی صنعت میں بہت حد تک خود کفیل ہو جائیں گے اور ہمیں دوسروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑیں گے۔

پاکستان کی قوت کا اصل سرچشمہ پاک فضائیہ ہے۔ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام سے لے کر دور حاضر تک پاک فضائیہ نے جرأت اور بہادری کی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔ آج بھی پاک فضائیہ کا شمار دنیا کی بہترین فضائیہ میں ہوتا ہے۔ پاک فضائیہ بہترین آلاتِ حرب سے مسلح ہے اور چار سو سے زیادہ طیاروں کو استعمال میں لا رہی ہے جن میں ایف ۱۶، ایف ۷، میراج ۳، میراج ۵، اے ۵ اور ایف ۶ جیسے شاہین صفت لڑاکا اور حملہ آور طیارے بھی شامل ہیں۔

جنرل ڈائنامکس ایف ۱۶

پاکستان کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو ایف ۱۶ طیاروں سے ناواقف ہو۔ یہ طیارہ اس صدی کا بہترین فوجی طیارہ سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں اس طیارے کی ابتدا ۱۹۷۲ کے کم وزن لڑاکا طیاروں کے مقابلے کے دوران ہوئی۔ اس مقابلے میں امریکہ کی دو شہرہ آفاق طیارہ ساز کمپنیاں جنرل ڈائنامکس اور نارتھروپ فائنل مقابلے میں پہنچیں۔ جنرل ڈائنامکس کا تیار کردہ پروٹو ٹائپ (ابتدائی نمونہ) وائی ایف ۱۶ تھا۔ جبکہ نارتھروپ کی طرف سے وائی ایف ۱۷ مدمقابل تھا۔ سخت مقابلے کے بعد آخر کار وائی ایف ۱۶ کو فاتح قرار دیا گیا۔

پاکستان نے پہلا ایف ۱۶ طیارہ نومبر ۱۹۸۳ء میں حاصل کیا۔ اس وقت ۴۰ کے قریب لڑاکا شاہین ہمارے ملک کی فضاؤں کی حفاظت پر مامور ہیں۔ ایف ۱۶ آواز سے دوگنی رفتار یعنی ۲۱۲۴ کلو

میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتا ہے۔ یہ طیارہ ساٹھ ہزار فٹ کی انتہائی بلندی تک پرواز کر سکتا ہے۔ مختلف فوجی حملوں کے لئے ایف ۱۶ کے پاس وسیع مقدار میں اسلحہ موجود ہے۔ مثلاً اندرونی طور پر نصب شدہ ایک عدد ۵۱۵ راؤنڈز کی ۳۰ ایم ایم، ۶۱ توپ کے علاوہ دوبدو جنگ کے لئے ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے سائڈ ونڈر میزائل، درمیانی فاصلے پر مار کرنے والے اسپیرو یا اسکائی فلیش میزائل، زمینی ہدف کو نشانہ بنانے کے لئے بم اور راکٹ کے علاوہ مختلف قسم کے ہوا سے زمین پر مار کرنے والے میزائل وغیرہ شامل ہیں۔ چند برس پہلے پاکستان نے مزید ۷۱ ایف ۱۶ کا آرڈر دیا تھا جن میں سے ۶۰ جدید ترین ایف ۱۶ سی/ڈی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈسالٹ میراج ۳/ سی پانچ/ پچاس (DASSAULTMIRAGE)

ایف ۱۶ کے بعد پاک فضائیہ کا اہم ترین سپوت میراج ہے جس کو فرانسیسی طیارہ ساز ادارے ڈسالٹ بریجیٹ نے تیار کیا ہے۔ اسے پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۵۶ میں اڑایا گیا۔ تقریباً ۱۴۳۰ میراج طیارے اب تک بن چکے ہیں۔ میراج تھری ۲۳، سے زائد فضائی قوتوں کے زیر استعمال ہے اور مختلف معرکوں میں اپنی کارکردگی کا لوہا منوا چکا ہے۔ طاقتور آٹار انجن کی بدولت یہ طیارہ ۲۳۵۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتا ہے۔ اس کے اسلحہ خانے میں اندرونی نصب شدہ دو عدد ۱۲۵ راؤنڈز ۳۰ ایم ایم ڈیفا توپوں کے علاوہ ماٹرا میجیک، سائڈ ونڈر، ماٹرا ۵۳۰ میزائل دشمن طیارے کی خوب تواضح کرتے ہیں۔ پاک فضائیہ نے پہلی بار ۱۹۶۸ء میں میراج تھری طیارے حاصل کئے تھے جنہوں نے ۱۹۷۱ کی پاک بھارت جنگ کے دوران بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغیر کسی نقصان کے ۸ بھارتی طیارے تباہ کر ڈالے جب کہ دو کامیاب زمینی حملے بھی سرانجام دیئے۔ اس وقت پاکستان ۲۸ میراج تھری طیارے استعمال میں لا رہا ہے۔ جس میں ۱۳ عدد جاسوسی مقاصد کے میراج تھری کے آر ماڈل بھی شامل ہیں۔

میراج ۵ (MIRAGE)

پاک فضائیہ میراج تھری کی ایک اور حربی شکل میراج ۵ کو بھی استعمال میں لا رہی ہے۔ پاک فضائیہ نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر میں ۵۰ میراج ۵ طیارے حاصل کئے۔ اے ایم ۳۹ نظام کی بدولت میراج فائیو ۵۰ سے ۷۰ کلو میٹر کی حدود میں کسی بھی بحری جہاز کے لئے قیامت بن سکتا ہے۔

نان چنگ اے۔ ۵ ایم "فینٹن" چائنہ (NANCGANG A-5M FANTANCGINA)

اسے پہلی بار جون ۱۹۶۵ میں اڑایا گیا اور اب تک یہ طیارے ۱۰۰۰ بن چکے ہیں۔ یہ ایف ۶ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

ایک سستا لڑاکا طیارہ

ایک جدید طیارہ
وائی-۲۳

دنیا کا مہنگا ترین بمبار طیارہ

ہیلی کاپٹر نما ہوائی جہاز

جنگ ستمبر کی یاد میں لکھی جانے والی ایک تحریر۔

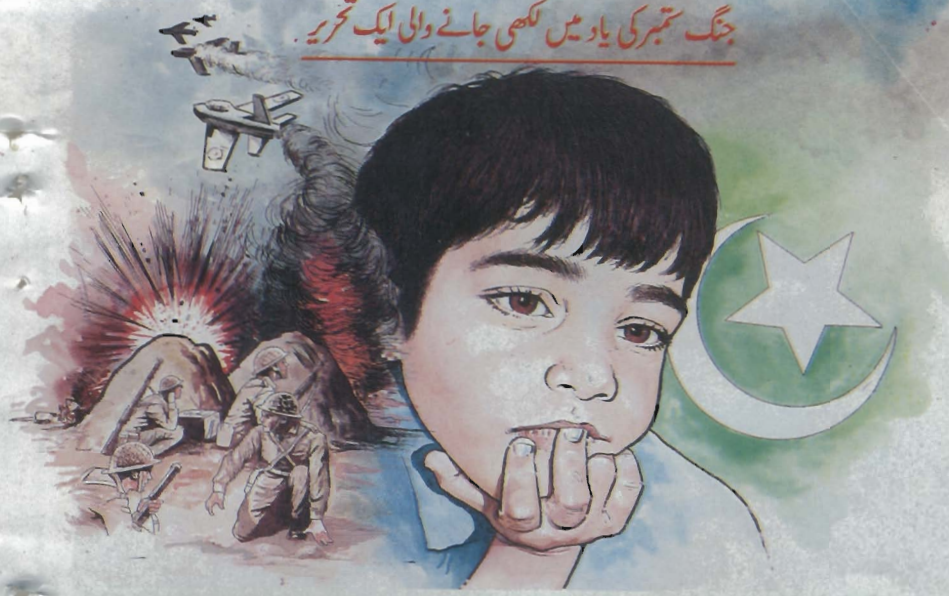

فائر کھول دو

طاہر مسعود

ستائیس سال بیت گئے۔

اس جنگ کو ہوئے پورے ستائیس سال بیت گئے۔ مگر اس کی یاد دل پہ آج تک نقش ہے میں اسکول میں پڑھتا تھا اور جنگوں کے بارے میں صرف کتابوں میں پڑھا تھا اور اتنا ہی جانتا تھا کہ جب جنگ ہوتی ہے تو بے گناہ انسان مارے جاتے ہیں۔ گھر، اسکول، کھیت کھلیان سب تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ پھر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

میں صبح کو سو کر اٹھا تو گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی۔ ابا ریڈیو کی سوئی گھما رہے تھے اور بقیہ لوگ اخبار پر جھکے ہوئے تھے اور یہ سب کچھ معمول کے برخلاف تھا۔

"آج تمہیں اسکول نہیں جانا ہے" ابا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور اتنا کہہ کر دوبارہ ریڈیو کی سوئی گھمانے لگے۔ یہ اطلاع میرے لئے بہت خوشگوار تھی لیکن یہ جاننے میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی کہ اتنی اچھی اطلاع کا سبب کیا ہے میں نے محسوس کیا

کہ سب لوگوں کے چہروں پر ایک عجیب سا جوش و خروش تھا۔ میری عمر چونکہ بہت کم تھی اس لئے کسی نے مجھے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ مجھے اسکول نہیں جانا ہے تو کیوں نہیں جانا ہے۔ ابا ریڈیو کی سوئی کیوں گھمائے جا رہے ہیں اور یہ سب لوگ اخبار میں کیا پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا سوچ رہا تھا کہ شنو نے قریب آکر میرے کان میں کہا!

"پتا ہے..... جنگ چھڑ گئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اور میرے کانوں میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں گونجنے لگیں، تلواریں ٹکرانے لگیں..... سُموں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ ابا ایک بار جب ہم لوگوں کو فلم دکھانے لے گئے تھے تو اس تاریخی فلم میں جنگ کا منظر اسی قسم کا تھا۔ مگر یہ جنگ کس میدان میں لڑی جا رہی ہے۔ چل کر دیکھنا چاہئے بلکہ مجھے خود بھی اس میں حصہ لینا چاہئے۔ تلوار سے لڑنے کا شوق تو دل میں پہلے سے تھا اور چھڑی کی تلوار بنا کر میں کئی بار کفار کی فوجوں کو شکست فاش دے چکا تھا۔

"کھڑے کیوں ہو۔ جاؤ جا کر دانت صاف کرو" ابا کی ڈانٹ پڑی اور میں وہاں سے کھسک لیا۔

"اماں..... ایک بات پوچھوں" میں نے ناشتہ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"ہاں، ہاں کہو بیٹا" انھوں نے پیار سے کہا۔

"اماں..... یہ جنگ کہاں پہ ہو رہی ہے۔"

"سرحدوں پہ بیٹے۔ جنگ سرحدوں ہی پہ ہوتی ہے۔"

"اماں میں وہاں جا سکتا ہوں؟"

"کیا؟" اماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔"

"میں دیکھوں گا اماں..... جنگ کیسے ہوتی ہے؟"

اس کے لئے تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے انو۔ یہ تو تم یہیں سے دیکھ لو گے۔"

"یہاں سے.....؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... کسی وقت بھی دشمن کے طیارے آئیں گے اور بم برسا کر چلے جائیں گے۔ تم جلدی سے ناشتہ کر لو۔ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" اماں نے جلدی سے کہا اور پلیٹیں سمیٹنے لگیں۔

میرا جی ناشتے میں نہیں لگا۔ اماں نے کئی نئی باتیں بتائی تھیں اور میں ان کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ دوپہر تک مجھے اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ بھارت نے رات کی تاریکیوں میں ہماری سرحدوں پہ حملہ کر دیا ہے اور ہماری فوج سخت لڑائی میں مصروف ہے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے کھیل کے میدان میں دیکھا..... وہاں بہت سے

لوگ جمع ہو کر گڈھا کھود رہے تھے۔ میں چپکے سے آنکھیں بچا کر گھر سے نکل گیا وہاں بھی میں نے ویسا ہی جوش و خروش پایا۔ موتی بھی ان ہی لوگوں کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ میرا دوست تھا، مجھ سے عمر میں بڑا تھا، اس لئے اکثر مجھے مارتا تھا میں اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی قمیض کا دامن کھینچ کر کہا! "موتی بھائی! یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

موتی مڑا..... اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"انو کے بچے! میری قمیض کیوں پکڑ رکھی ہے۔"

میں نے قمیض چھوڑ دی۔

"یہ لوگ خندق کھود رہے ہیں انو جنگ چھڑ گئی ہے نا"

"خندق..... یہ کیا ہوتا ہے؟"

"جب دشمن کے طیارے بم برسائیں گے تو ہم لوگ اس میں چھپ جائیں گے۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر ہم لوگ بچ جائیں گے۔"

"اور ہمارا یہ کھیل کا میدان؟"

"ہم کھیلنے کے لئے دوسرا میدان بنا لیں گے!"

میں چپ ہو گیا۔ میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میرا ذہن گڈمڈ ہو گیا۔

اس شام ریڈیو بیٹھک میں لا کر رکھ دیا گیا۔ محلے کے بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ گھڑی کی سوئی نے چھ بجائے اور آواز آئی

"یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ اب! آپ شکیل احمد سے خبریں سنئے۔" آواز نہایت گرج دار تھی۔ میں کمرے سے نکل گیا۔ جب لوٹا تو ریڈیو سے آواز آ رہی تھی! "صدر ایوب نے کہا کہ دشمن کو نہیں معلوم ہے کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ یہ دس کروڑ مسلمان جن کے دلوں میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے کلمات گونجتے ہیں، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں کے دہانے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش نہ ہو جائیں۔"

مجھے ان جملوں کے معنی ٹھیک سے نہیں معلوم تھے لیکن ان میں کوئی ایسی بات تھی کہ میری مٹھیاں بھینچ گئیں اور میرا دل چاہا کہ میں اپنی لکڑی کی تلوار اٹھاؤں اور جا کر دشمن کو تہس نہس کر دوں۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ اور سارا شہر اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے ہول سا اٹھنے لگا اتنا اندھیرا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ابا بتا رہے تھے۔ بلیک آؤٹ ہو گا۔ جب تک جنگ چلتی رہے گی کسی قسم کی روشنی نہ کی جائے۔ حتیٰ کہ ماچس کی تیلی بھی نہ جلائی جائے۔

"کیوں ابا..... روشنی کیوں نہیں ہونی چاہئے" شنو نے پوچھا۔

"روشنی سے دشمن کے طیاروں کو بم گرانے

میں آسانی ہوجاتی ہے۔"

"ابا بم گرتا ہے تو کیا ہوتا ہے" میں نے سوال کیا۔

"سب کچھ تباہ ہوجاتا ہے انو..... لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ہماری حفاظت کرنے والا ہے۔"

میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن چپ ہوگیا۔ اصل میں مجھے یاد آگیا تھا کہ ماسٹر صاحب اسکول میں کہا کرتے تھے۔

"مسلمان کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔"

اتنے میں شنو نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔

اے وطن کے سجیلے جوانو
میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

کتنی شیریں آواز تھی۔

کیسی من موہنی جیسے کسی نے کانوں میں رس گھول دیا ہو۔

میں گھر سے نکلا تو یہ آواز دیر تک میرا پیچھا کرتی رہی پھر میں نے موتی کو آتے دیکھا۔ اس کے سفید جوتوں پر کچھ لکھا تھا۔

"موتی بھائی..... آپ کے جوتوں پر کیا لکھا ہے۔"

"یہ انگریزی میں لکھا ہے انو..... تم نہیں پڑھ سکتے۔"

"بتایئے نا..... کیا لکھا ہے" میں نے پھر تجسس سے پوچھا۔

"میرے دائیں جوتے پر لکھا ہے open fire اور میرے بائیں جوتے پر ہے crush India کیا سمجھے؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن میں موتی سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا ورنہ وہ میرا اور مذاق اڑاتا۔

"بیوقوف انو اس کا مطلب ہے فائر کھول دو اور بھارت کو تباہ کر دو" موتی نے ہنس کر کہا۔

"بھارت تو بہت بڑا ملک ہے موتی بھائی۔ کیا ہم اسے تباہ کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ ہم اس کے دانت توڑ دیں گے۔" موتی نے گھونسہ لہراتے ہوئے کہا۔

"کیا بھارت کے دانت ہیں؟ کیا آپ نے اس کے دانت دیکھے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"انو۔ تم سوال بہت کرتے ہو۔ بیوقوف ہونا اس لئے۔" اور یہ کہہ کر موتی وہاں سے چل دیا۔

اس رات میں سویا تو عجیب عجیب سے خواب آتے رہے میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اچانک سائرن خوفناک طریقے سے بجنے لگا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سنا باہر گلیوں میں لوگ بھاگ رہے تھے۔ پھر کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی میں برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ اندھیرے میں ایک سائے نے مجھے دبوچ لیا۔ یہ ابا تھے۔ وہ مجھے ساتھ لئے تیز تیز قدموں سے دالان عبور کر کے سیڑھیوں تلے دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ وہاں اماں تھی، شنو

تھی، گھر کے دوسرے لوگ تھے۔ چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا دفعتاً فضا طیاروں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی میں نے ابا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اب بم گرے گا اور ہر چیز تباہ ہو جائے گی میں نے سوچا لیکن طیارے گزر گئے۔

"لگتا ہے ہمارے ہی طیارے تھے دشمن کے پیچھے گئے ہیں۔" ابا نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد سائرن بجنے لگا۔ مگر اب کے اس کی آواز پر سکون تھی۔

اگلی دوپہر ابا گھر آئے تو جلدی میں تھے۔ مجھ سے بولے "چلو گے میرے ساتھ" اور پھر میرا جواب سنے بغیر میری انگلی تھام لی وہ کوئی اسکول کا احاطہ تھا جہاں بہت سے لوگ قطار بنائے کھڑے تھے ابا نے بتایا یہ سب لوگ پاک فوج کے زخمی جوانوں کے لئے خون دینے آئے ہیں۔

"میں بھی خون دوں گا ابا"

"نہیں۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔" انھوں نے میرا گال پیار سے تھپتھپایا۔

"میں چھوٹا نہیں ہوں..... یہ دیکھئے" یہ کہہ کر میں پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ قطار میں موجود لوگ ہنسنے لگے۔ اور جب ابا کی باری آئی تو میں لپک کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا میں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی خون دینے کے لئے اپنی آستین بھی چڑھالی تھی۔

"انو پیچھے ہٹ جاؤ۔" ابا کی آواز آئی۔

"میں خون دوں گا ابا۔"

"لیکن ابھی تم بچے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"میں بچہ نہیں ہوں۔ میں اسکول جاتا ہوں۔ میں روز آنہ دودھ کا گلاس پیتا ہوں۔ میرے بدن میں بہت خون ہے۔" میں نے کہا

ڈاکٹر مسکرایا اس نے شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "ایک بات تو بتائیے۔ آپ اچھے بچے ہیں نا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر اچھے بچے اپنے ابو کا کہا مانتے ہیں۔"

میں نے ابا کا کہا مان لیا لیکن مجھے یاد ہے، واپسی پہ میں روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ "ابا آپ بہت خراب ہیں۔ آپ بہت گندے ہیں۔" وہ ہنستے تھے اور مجھے پیار کرتے جاتے تھے۔

آج میں اپنی یادوں کی دنیا میں جھانکتا ہوں تو بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے آپ کو دہرانے لگتی ہیں۔

جنگ تو سترہ دن کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی۔ ایک روز میں نے پوچھا۔ "ابا یہ جنگ تو ہم جیت گئے ہیں نا"

ابا چپ رہے۔ ان کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا!

"شاید..... لیکن انو۔ ابھی جنگ ختم کہاں ہوئی ہے۔"

ابا سچ کہتے تھے۔ ستائیس سال گزر جانے کے باوجود جنگ کہاں ختم ہوئی ہے۔ ایک فیصلہ کن جیت تو ابھی باقی ہے!!!

مناسب دام ۔ بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
- دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

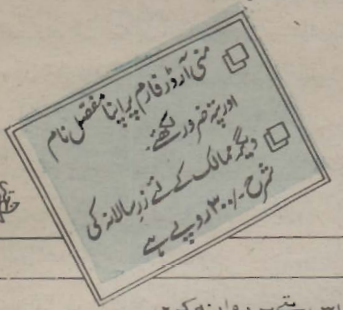

ماہ نامہ آنکھ مچولی ۱-پی آئی بی کالونی۔ کراچی نمبر ۵ ۔ ۷۴۸۰۰

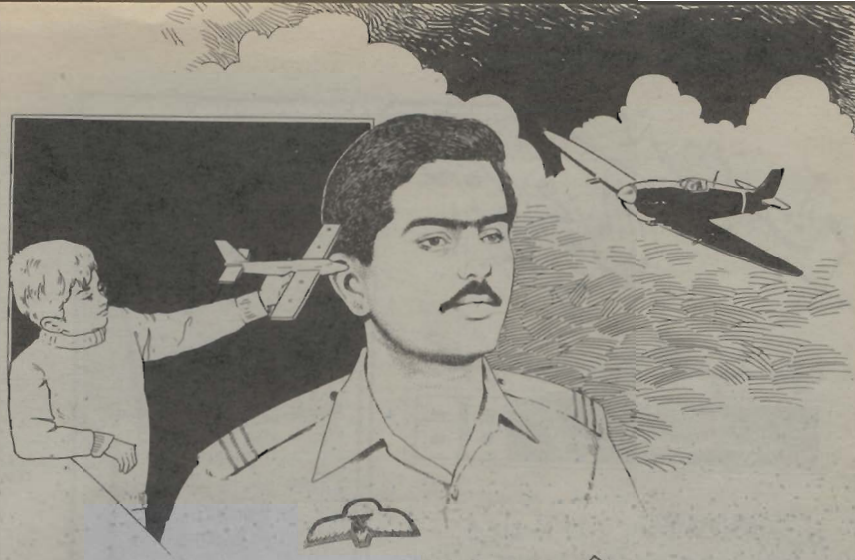

شاہین

صبا احمد

ایک بچہ جیسے ہی ہوائی جہاز کی آواز سنتا فوراً ہی اپنے ننھے ننھے قدموں سے بھاگتا ہوا اپنے کمرے سے لان میں آجاتا اور جہاز کو فضا میں اڑتے ہوئے بڑے انہماک سے اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ ابھی وہ بولنے کے قابل نہ تھا لیکن خوش ہو ہو کر اپنی انگلی سے جہاز کی طرف اشارہ کرتا اور جب وہ معصوم بچہ بولنے کے قابل ہوا تو اتفاقاً ایک دن وہ اپنے لان میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ گیند کھیل رہا تھا کہ اچانک ہوائی جہاز کی تیز آواز اسکی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے ڈیڈی سے کہا کہ ڈیڈی میں یہ جہاز اڑاؤں گا۔ انہوں نے اپنے اس ننھے سے بچے کو لپک کر گود میں اٹھالیا اور اسکے منہ کو بے اختیار چوم کر کہا کہ ہاں میرے بیٹے تم ایک دن یہ جہاز اڑاؤ گے کیونکہ تم شاہین ہو اور شاہین ہمیشہ اونچی پرواز کرتا ہے۔ اور پھر انہوں نے اپنے اس بچے کے لئے قسم قسم کے کھلونے والے جہاز لانے شروع کر دیئے اور اسکے پاس جلد ہی ان کا ڈھیر لگ گیا اور وہ بڑے ذوق و شوق سے ان جہازوں کو اڑاتا رہتا اور خیالوں ہی خیالوں میں خود کو پرواز کرتے دیکھتا اور بالآخر ایک دن وہ بھی آگیا جب اس نے حقیقت میں ہوائی جہاز اڑایا اور یہ اس کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا جب اسکا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ اور وہ بڑی شان سے جہاز اڑاتا ہوا بادلوں کو چیرتا ہوا بلند پرواز کرتا رہا۔ آج اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا

بے شک آج اس کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ معصوم بچہ کون تھا؟ جی ہاں یہ معصوم بچہ شاہین نواز تھا جس نے ایک پڑھے لکھے اور معزز گھرانے میں سابق مشرقی پاکستان کے شہر چٹاگانگ میں ۳ دسمبر ۱۹۵۷ء میں آنکھ کھولی۔ اس کے بعد وہ کراچی آگئے اور انہوں نے کینٹ پبلک اسکول میں ۱۹۶۳ء میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے ۱۹۷۴ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں بہت سرگرم تھے۔ نہایت ملنسار اور ہنس مکھ تھے یہی وجہ تھی کہ اپنے اساتذہ اور اپنے دوستوں میں بے حد مقبول تھے ان کا حلقہ احباب خاصہ وسیع تھا۔

اپنے بچپن کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے اور اپنے وطن کی محبت اور اس کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر ایئر فورس جوائن کرنے کا ارادہ کیا اور نومبر ۱۹۷۵ء میں P .A .F کالج سرگودھا میں بہ حیثیت فلائٹ کیڈٹ G. D (P) شمولیت اختیار کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی ایک مکمل شاہین کی طرح گزاری جو ان کے نام سے ظاہر ہے۔

چار سال تک وہ پی اے ایف کالج سرگودھا میں G. D (P) پائلٹ کی ٹریننگ میں رہے۔ جہاز پر انہوں نے مختلف ٹیکنک اور اپنے کام میں مہارت حاصل کی اس کے ساتھ ساتھ وہ جوڈو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ۱۹۷۹ میں ان کو فلائنگ کلر ملا اور ساتھ ہی بی۔ ایس۔ سی۔ کی ڈگری (Arionics) میں حاصل کی اس کے بعد انہوں نے P .A .F اکیڈمی رسالپور جوائن کیا جہاں سے انہوں نے (SAAB) طیاروں پر ٹریننگ حاصل کی اور اس کے بعد (T. 37s) جہاز پر تعینات ہو گئے۔ ان کی امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے اسپیشل سروسز گروپ کی جانب سے۔ (PARA WING) بھی حاصل کیا ہوا تھا جس کو وہ بہت ہی فخر سے پہنتے تھے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کو گو کہ موسم ناموافق تھا لیکن چونکہ ان کو اپنی ڈیوٹی انجام دینی تھی لہٰذا معاون پائلٹ شاہین نواز ایک تجربہ کار انسٹرکٹر کے ہمراہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آکر کاک پٹ میں اپنی اپنی سیٹوں پر جلدی سے بیٹھ گئے۔ فضا میں جہاز تیزی سے بلند ہوا۔ موسم مزید خراب ہو گیا۔ آسمان پر گہرے گہرے سیاہ بادل چھا گئے۔ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ تجربہ کار اور ماہر انسٹرکٹر نے بھرپور کوشش کی لیکن ہائے تقدیر، جس نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور جہاز سوات کے پہاڑوں سے ٹکرا گیا۔

یکم جنوری ۱۹۸۲ء کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع تو ہوا لیکن دکھوں کا پیغام لے کر آیا۔ شاہین کو سینکڑوں سوگواروں نے اپنی پرنم آنکھوں سے کورنگی کریک کے ایئر فورس قبرستان میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا اور اس طرح ایک پرعزم، بہادر، نڈر اور جیالا پائلٹ کسی جنگ میں اپنے جوہر دکھائے بغیر اور دل میں دشمنوں کے دانت کھٹے کرنے کی حسرت لئے عین عالم شباب میں شہید ہو گیا۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

ننھے نگاش شہ پارے

عبارہ احمد

جہاز اپنے گھر پر سے جب بھی گزرتے
تو آنگن میں بھیا
کھلے آسماں پر پرندوں کی طرح
سے اڑتے ہوئے ان جہازوں سے کہتا
"چلو آج تم بھی ذرا موج کرلو، بڑا ہوگیا میں تو دیکھوں گا کیسے
کوئی ان جہازوں سے اوپر اڑے گا
جنہیں میں چلاؤں گا، اونچا اڑوں گا"
میرے پاس آتا تو مجھ سے یہ کہتا
بتاؤ ناں بجیا بڑا کب میں ہوں گا
میرا قد تو ناپو
میں کہتی کہ بھیا، ابھی چار دن پہلے تو ناپا تھا قد کو
تو چڑ کر وہ کہتا
چلو ٹھیک ہے پر ذرا یہ بتاؤ
کہ جب میں جہازوں میں اوپر اڑوں گا
تو تم کیا کروگی
پتا ہے مجھے تم بہت ہی چڑوگی
کہوگی
بڑا ہوگیا کیوں یہ چھوٹا سا لڑکا
وہ ناراض ہوتا تو ہنس کر میں کہتی
نہیں پیارے بھیّا
جہازوں کو جب تم اڑاؤ گے اونچا
جو دشمن پہ لپکو گے شاہین بن کر
تو میں تو تمہیں بس دعائیں ہی دونگی

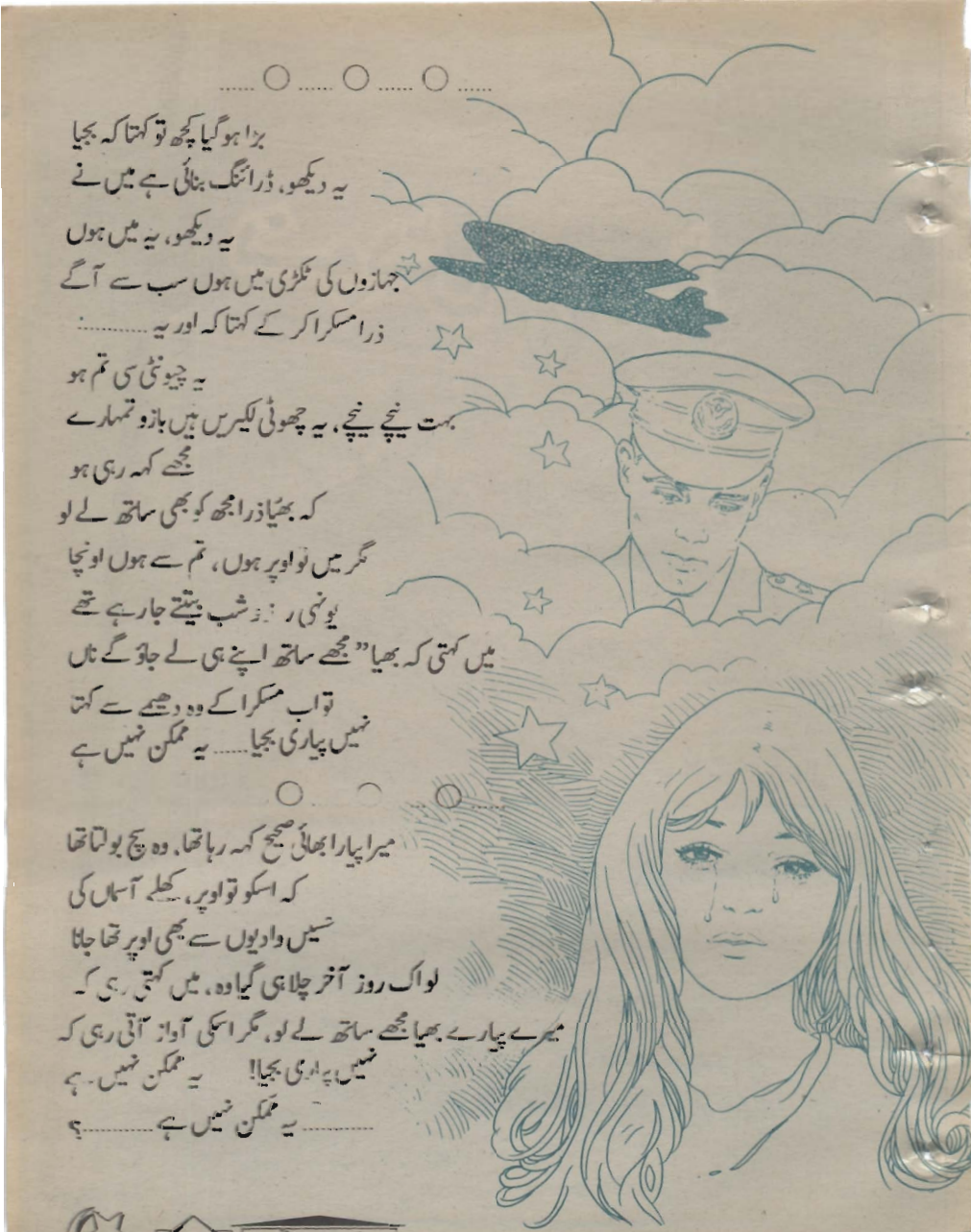

.... O .... O .... O ....

بڑا ہو گیا کچھ تو کہتا کہ بجیا
یہ دیکھو، ڈرائنگ بنائی ہے میں نے
یہ دیکھو، یہ میں ہوں
جہازوں کی ٹکڑی میں ہوں سب سے آگے
ذرا مسکرا کر کے کہتا کہ اور یہ ....
یہ چیونٹی سی تم ہو
بہت نیچے نیچے، یہ چھوٹی لکیریں ہیں بازو تمہارے
مجھے کہہ رہی ہو
کہ بھیاذرا مجھ کو بھی ساتھ لے لو
مگر میں تو اوپر ہوں، تم سے ہوں اونچا
یونہی ر : ز شب بیتتے جارہے تھے
میں کہتی کہ بھیا" مجھے ساتھ اپنے ہی لے جاؤ گے ناں
تو اب مسکرا کے وہ دھیمے سے کہتا
نہیں پیاری بجیا...... یہ ممکن نہیں ہے

O O O

میرا پیارا بھائی صحیح کہہ رہا تھا، وہ سچ بولتا تھا
کہ اسکو تو اوپر، کھلے آسماں کی
حسیں وادیوں سے بھی اوپر تھا جانا
لو اک روز آخر چلا ہی گیا وہ، میں کہتی رہی کہ
میرے پیارے بھیا مجھے ساتھ لے لو، مگر اسکی آواز آتی رہی کہ
نہیں پیاری بجیا! یہ ممکن نہیں ہے
یہ ممکن نہیں ہے ....؟

نوٹس بورڈ

• اگر آپ آنکھ مچولی میں لکھتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں تو درجِ ذیل باتیں ضرور پڑھ لیجئے۔

آنکھ مچولی میں تمام تحریریں اپنے معیار کے مطابق نمبر آنے پر شائع ہوتی ہیں۔

آنکھ مچولی میں (سوائے "قلم قبیلے" کے) تمام شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ دیا جاتا ہے

نقل شدہ تحریروں، انتخاب، اقوال وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

آپ تحریریں بھجوانے سے قبل یہ اطمینان ضرور کر لیں کہ آپ کی ہر تحریر کے پیچھے آپ کا نام اور پتہ صاف صاف لکھا ہوا ہے۔

ایک کاغذ پر دو مختلف نوعیت کی تحریریں قابلِ قبول نہ ہوں گی۔

اپنی تحریروں کے بارے میں یا کچھ اور جاننے کے لئے جوابی لفافہ ضرور بھجوائیں۔

۶۵ء کی جنگ پر
غیر ملکی اخبارات کے تاثرات

انتخاب: غلام عباس طاہر

"جو قوم (پاکستانی قوم) موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو، اسے کون شکست دے سکتا ہے۔ جوان سے جرنیل تک کو میں نے اس طرح آگ کے ساتھ کھیلتا دیکھا جس طرح گلیوں میں بچے کانچ کی گولیوں سے کھیلتے ہیں۔" (امریکی ہفت روزہ ٹائم، ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء)

بھارتی بری طرح ناکام ہوئے۔ پاکستانیوں کی نفری کم تھی ہتھیار بھی کم مگر وہ ہیبت ناک غضب سے لڑے اور جیت گئے۔" (روزنامہ "مرر" لندن)

ٹائمز آف انڈیا، بمبئی کی ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔ "دشمن (پاکستان) تمام محاذوں پر جس غیض و غضب سے لڑ رہا ہے، اس کے پیشِ نظر انڈین آرمی کے لئے پاکستان کی سرحد میں پیش قدمی کرنا آسان نہیں رہا۔" "ٹائمز آف انڈیا، ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء)

۱۹۶۲ء کے بعد (چین سے شکست کھا کر) بھارتی فوج کی نفری اور قوت دگنی اور چنگی بجٹ تین سو کروڑ سے بڑھا کر نو سو کروڑ روپے سالانہ کر دیا گیا تھا۔ تاکہ ایک حملے سے پاکستان فتح کر لیا جائے۔" (سابق بھارتی کمانڈر انچیف بی ایم کول کی کتاب "ان کہی کہانی" سے اقتباس)

"فائر بندی ہوئے تین گھنٹے گزر گئے ہیں میں ٹینکوں اور انسانوں کے قبرستان میں گھوم رہا ہوں۔ میرے سامنے بھارت کے پچیس ٹینک جلے پڑے ہیں۔ میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ پاک فوج کے جوان میرے سامنے تین سو بھارتیوں کی لاشیں دفن کر چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان نے بھارت کے آرمرڈ ڈویژن کا بھرکس نکال دیا ہے۔" (روزنامہ "مرر" لندن)

"پاکستانی بہادر لوگ ہیں۔ بے خوف پاکستانیوں اور بد دل ہندوستانیوں کو دیکھ کر پروپیگنڈے کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔" (گارڈین "لندن" ۴، اکتوبر ۱۹۶۵ء)

۱۵، ستمبر ۱۹۶۵ کی امریکن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی نشریات میں رائے میلونی کہتا ہے "میں یہ حقیقت ریکارڈ میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے ایسے خود اعتماد اور فاتح سپاہی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جیسے پاک فوج میں دیکھ رہا ہوں۔"

بارسلونا اولمپکس ۱۹۹۲ء

ضیاالرحمٰن ضیا

بارسلونا میں تاریخ کے سب سے بڑے اولمپک کھیل ختم ہوگئے۔ یہ اولمپکس ہفتہ ۲۵ جولائی سے شروع ہوئے تھے اور ان کا اختتام سولہ دن کے بعد اتوار ۹ اگست کو ایک پروقار اور رنگارنگ تقریب میں ہوا۔

بارسلونا اولمپکس میں دنیا کی سب سے زیادہ اقوام نے شرکت کی۔ آئی او سی یعنی انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے رکن ممالک کی مجموعی تعداد ۱۷۲ ہے۔ ان میں سے ۱۷۱ ممالک نے اپنے کھلاڑی بارسلونا بھیجے۔ صرف افغانستان وہ واحد ملک ہے جس کے کھلاڑی اولمپکس میں شریک نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کے عوام نے گذشتہ چودہ برس کمیونسٹ حکومت سے جنگ کرنے کے بعد حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ تاہم افغان حکومت نے بارسلونا اولمپکس میں اپنے ملک کی نمائندگی کے لئے ایک عہدیدار بھیجا۔

بارسلونا اولمپکس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کسی ملک نے بائیکاٹ نہیں کیا۔ جنوبی افریقہ نے ۳۲ برس اور کیوبا اور شمالی کوریا نے ۱۳ برس بعد اولمپک کھیلوں میں حصہ لیا۔ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کا اتحاد ہونے کے بعد یہ ممالک ۳ اکتوبر ۱۹۹۰ء سے جرمنی کہلانے لگے۔ ان ممالک کو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی جرمنی کہا جاتا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی بڑی طاقتوں نے اس

بارسلونا اولمپکس میں ۳ ہزار میٹر اسٹیپل چیز میں کینیڈین گریم فل اور فرانسیسی تھیٹری بروسوا کے درمیان مقابلہ کا ایک دلچسپ منظر۔

ملک کو دو حصوں مشرقی اور مغربی جرمنی میں تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے برلن اولمپکس کے بعد جرمنی کے دونوں حصوں کے کھلاڑیوں نے بارسلونا میں ایک ہی پرچم تلے شرکت کی۔ اسی طرح سوویت یونین بھی ٹوٹ پھوٹ کر کئی ریاستوں میں تقسیم ہوچکا ہے۔ سابقہ سوویت یونین کی گیارہ آزاد ریاستوں کی دولتِ مشترکہ اور جارجیا نے ایک ٹیم (متحدہ ٹیم) کی حیثیت سے بارسلونا اولمپکس میں حصہ لیا۔ ادھر ایک اور کمیونسٹ ملک یوگوسلاویہ میں بھی مظالم کی وجہ سے وہاں کی کئی ریاستوں نے آزادی کا اعلان کر دیا ہے اس میں "بوسینا، ہرزے گووینا" کی مسلم ریاست بھی شامل ہے۔ یوگوسلاویہ کی فوج، آزاد ہونے والی ریاستوں کے خلاف جنگ کر رہی ہے اور وہاں پانچ ہزار بچوں کو بھی زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا ہے یوگوسلاویہ کے ان مظالم کی وجہ سے اقوامِ متحدہ نے یوگوسلاویہ پر اولمپک کھیلوں میں شرکت پر پابندی عائد کر دی اور اس کے کھلاڑیوں کو اپنے ملک کی نمائندگی کے بجائے صرف الگ الگ حصہ لینے کی اجازت دی۔

بارسلونا اولمپکس میں گیارہ ہزار سے زیادہ کھلاڑیوں نے مختلف کھیلوں کے ۲۵۷ مقابلوں میں حصہ لیا۔ ان اولمپکس میں دو نئے کھیل (بیڈمنٹن اور بیس بال) پہلی بار شامل کئے گئے۔

بارسلونا اولمپکس میں زیادہ تر یورپ اور مغربی دنیا کی اقوام چھائی رہیں۔ تمغوں کے اعتبار سے متحدہ ٹیم پہلے، امریکہ دوسرے اور جرمنی تیسرے نمبر پر رہا۔ ایشیائی ملکوں میں جو ملک سرفہرست رہا وہ پاکستان کا عظیم دوست اور ہمسایہ چین ہے۔ چین نے مجموعی طور پر چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ میزبان اسپین چھٹے نمبر پر رہا۔ (واضح رہے کہ ٹیم کی پوزیشن کے تعین میں تمغوں کی مجموعی تعداد کے بجائے سونے کے تمغوں کو اوّلیت دی جاتی ہے)

بارسلونا اولمپکس میں جن ۱۷۱ ملکوں کے کھلاڑیوں نے حصہ لیا ان میں سے صرف ۶۴ ملکوں کے کھلاڑی تمغہ حاصل کر سکے جبکہ دنیا کی ۱۰۷ اقوام ان کھیلوں میں تمغوں سے محروم رہیں۔

بارسلونا اولمپکس میں پاکستانی دستے میں یہ ۲۷ کھلاڑی شامل تھے۔

ایتھلیٹکس (چار) بنارس خان، غلام عباس، نادر خان اور عارف حسین

باکسنگ (چار) ارشد احمد، محمد اصغر، ابرار حسین اور خیبر شاہ

ہاکی (سولہ) شاہد علی خان، منصور احمد، محمد اخلاق، فرحت خان، خواجہ جنید، رانا مجاہد، خالد بشیر انجم سعید، محمد خالد، طاہر زمان، قمر ابراہیم، وسیم فیروز، محمد شہباز، شہباز احمد، مصدق حسین اور آصف باجوہ۔

کشتی (ایک) نصیر احمد

بارسلونا جانے والے ان پاکستانی کھلاڑیوں کی تربیت پر کروڑوں روپے خرچ کئے گئے تھے۔ توقع تھی کہ پاکستان کے کھلاڑی ہاکی میں سونے کا تمغہ جیت لیں گے اور دیگر کھیلوں میں کوئی تمغہ حاصل نہ کر سکے تب بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن سوائے ہاکی کے پاکستان کے کھلاڑی اپنے پہلے میچ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ پاکستان کے باکسر محمد اصغر کو ایک مقابلے میں فاتح قرار دیا گیا۔ وہ مقابلہ بھی وہ خود نہ جیت سکے بلکہ ان کے حریف ایرانی باکسر کے مقررہ وقت تک میدان میں نہ پہنچنے کے سبب انہیں واک اوور دیا گیا۔ کشتی رانی کے ۴۷۰ کلاس کے مقابلے میں کل ۳۷ ملکوں نے حصہ لیا اور اس میں پاکستان ۳۶ ویں نمبر پر آیا۔

ہاکی ٹیم پر منیجر اصلاح الدین اور کوچ منور الزماں نے سخت محنت کی پاکستان نے لیگ میچوں میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ٹورنامنٹ کی واحد ٹیم تھی جس نے لیگ میچوں میں نہ تو کوئی میچ ہارا اور نہ ہی اسکا کوئی میچ برابری پر ختم ہوا۔ لیکن سیمی فائنل میں پاکستان کے کھلاڑی عمدہ کھیل پیش کرنے کے باوجود جرمنی سے ایک کے مقابلے میں دو گول سے ہار گئے۔ کانسی کے تمغے کے حصول کے لئے پاکستان اور ہالینڈ کے درمیان ایک بار پھر مقابلہ ہوا۔ پاکستان نے ہالینڈ کو ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد تین کے مقابلے میں چار گول سے شکست دے کر کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔

بارسلونا میں پاکستانی ٹیم کا نمایاں پہلو، یورپی ٹیموں کے خلاف ان ہی کا ہتھیار (پینالٹی کارنر) کا مؤثر استعمال تھا۔ فل بیک خالد بشیر کو اس سلسلے میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا انہوں نے بھرپور استعمال کیا۔ انہوں نے پینالٹی کارنر کے ذریعے آٹھ گول کئے۔ اس طرح وہ جرمنی کے فشر کے ساتھ سب سے زیادہ گول کرنے والے کھلاڑیوں میں دوسرے نمبر پر آئے۔

پاکستان کا کانسی کا تمغہ اس اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ جنوبی ایشیا کے ممالک کی تنظیم سارک میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جس نے کوئی تمغہ حاصل کیا۔ تنظیم کے دیگر ممالک بھارت، نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور مالدیپ کے کھلاڑی اپنے جسم پر ایک بھی تمغہ نہیں سجا سکے۔

مسلم دنیا میں ترکی سرفہرست رہا۔ ترکی نے سونے، چاندی اور کانسی کے دو دو تمغے جیتے۔ پوری مسلم دنیا (ایک ارب مسلمان) نے سونے کے چھ، چاندی کے نو اور کانسی کے بارہ تمغے جیتے۔ مسلم دنیا، انسانی زندگی کے اور شعبوں ہی میں نہیں بلکہ کھیلوں میں بھی بہت پیچھے ہیں۔

۱۹۹۶ء میں امریکہ کے شہر اٹلانٹا میں ہونے والے اولمپکس صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری مسلم اُمّہ کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

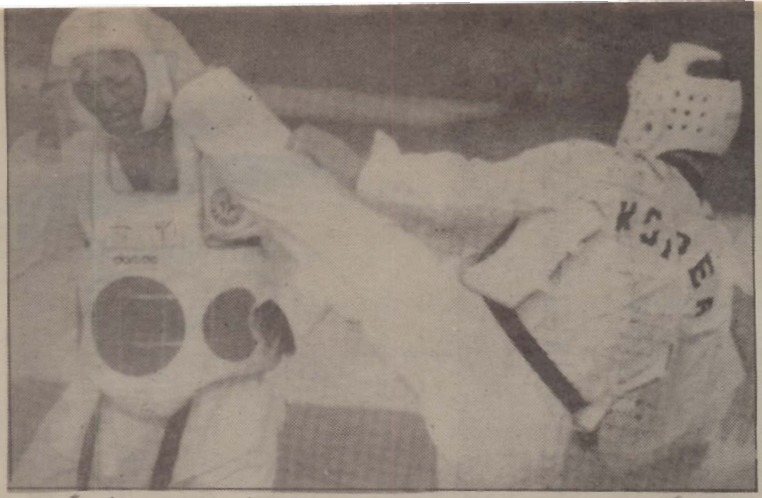

بارسلونا اولمپکس ہیوی ویٹ تائی کوانڈو مقابلہ میں جنوبی کوریا کے کم جے کیونگ (دائیں) نائیجیریا کے ایمانوئل اوگینی جیبو کے خلاف طلائی تمغہ جیت رہے ہیں۔

امریکی ایتھلیٹ کیون ینگ ۴۰۰ میٹر رکاوٹوں کی دوڑ میں طلائی تمغہ جیتنے کے بعد مارے خوشی کے زمین پر لوٹ رہے ہیں۔ انہوں نے یہ فاصلہ ۴۶٫۷۸ سیکنڈ زمیں طے کر کے نیا عالمی ریکارڈ بھی قائم کیا ہے۔

ٹیم	گولڈ میڈل	سلور میڈل	برانز میڈل
متحدہ ٹیم	۴۵	۳۸	۲۹
امریکہ	۳۷	۳۴	۳۷
جرمنی	۳۳	۲۱	۲۸
چین	۱۶	۲۲	۱۶
کیوبا	۱۴	۶	۱۱
اسپین	۱۳	۷	۲
جنوبی کوریا	۱۲	۵	۱۲
ہنگری	۱۱	۱۲	۷
فرانس	۸	۵	۱۶
آسٹریلیا	۷	۹	۱۱
اٹلی	۶	۵	۸
کینیڈا	۶	۵	۷
برطانیہ	۵	۳	۱۲
رومانیہ	۴	۶	۸
چیکوسلواکیہ	۴	۲	ایک
شمالی کوریا	۴	صفر	۵
جاپان	۳	۸	۱۱
بلغاریہ	۳	۷	۶
پولینڈ	۳	۶	۱۰
ہالینڈ	۲	۶	۷
کینیا	۲	۵	۲
ناروے	۲	۴	ایک
ترکی	۲	۲	۲
انڈونیشیا	۲	۲	ایک
برازیل	۲	ایک	صفر
یونان	۲	صفر	صفر
سویڈن	۱	۷	۴
نیوزی لینڈ	ایک	۴	۵
فن لینڈ	ایک	۲	۲
ڈنمارک	ایک	ایک	۴
مراکش	ایک	ایک	ایک
آئرلینڈ	ایک	ایک	صفر
ایتھوپیا	ایک	صفر	۲
الجزائر	ایک	صفر	ایک
ایسٹونیا	ایک	صفر	ایک
لیتھونیا	ایک	صفر	ایک
سوئٹزرلینڈ	ایک	صفر	صفر
جمیکا	صفر	۳	ایک
نائیجیریا	صفر	۳	ایک
لیبویا	صفر	۲	ایک
آسٹریا	صفر	۲	صفر
نمیبیا	صفر	۲	صفر
ساؤتھ افریقہ	صفر	۲	صفر
بلجیم	صفر	ایک	۲
کوریشیا	صفر	ایک	۲
ایران	صفر	ایک	۲
سابق یوگوسلاویہ	صفر	ایک	۲
اسرائیل	صفر	ایک	ایک
میکسیکو	صفر	ایک	صفر
پیرو	صفر	ایک	صفر
تائیوان	صفر	ایک	صفر
منگولیا	صفر	صفر	۲
سلوانیا	صفر	صفر	۲
ارجنٹینا	صفر	صفر	ایک
بھامس	صفر	صفر	ایک
کولمبیا	صفر	صفر	ایک
گھانا	صفر	صفر	ایک
ملائیشیا	صفر	صفر	ایک
پاکستان	صفر	صفر	ایک
فلپائن	صفر	صفر	ایک
پورٹوریکو	صفر	صفر	ایک
قطر	صفر	صفر	ایک
سرینام	صفر	صفر	ایک
تھائی لینڈ	صفر	صفر	ایک

MAGGI®
2-MINUTE NOODLES
"مم... میگی"
بھوک میں بچوں سے ذرا انتظار نہیں ہوتا، خصوصاً
کھیل کود کے بعد تو انہیں فوری کچھ کھانے کو
چاہیئے۔ اب میگی نوڈلز نے ماؤں کی یہ مشکل آسان کردی ہے۔
میگی نوڈلز بنانا نہایت آسان ہے۔
تیاری کا طریقہ:
۱: ایک کپ پانی اُبالیں۔
۲: میگی کے چار حصّے کریں اور اُبلتے ہوئے پانی میں ڈال دیں۔
۳: اب اس میں ٹیسٹ میکر ملائیں۔
۴: اور صرف دو منٹ تک پکائیں۔
لذیذ میگی نوڈلز تیار ہیں۔ یقیناً آپ کے بچے اسے
خوب مزے لے کر کھائیں گے۔
MAGGI
2-MINUTE NOODLES
MAGGI
2-MINUTE NOODLES
پل بھر میں تیّار، کھانے میں مزیدار

ببلو مجھے کو تنگ نہ کر!

شرارتی ببلو اور سمجھدار پپو کی رنگین باتصویر کہانی

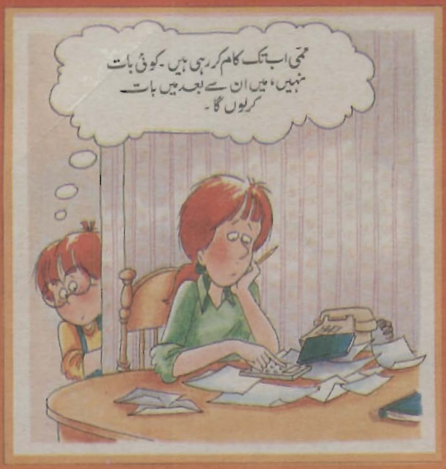

پیارے بچو! تم نے بلو اور پپو کی کہانی پڑھی اور تم نے دیکھا کہ بلو کتنا بے وقوف لڑکا ہے۔ ہر وقت شور اور ہنگامہ کر کے دوسروں کو تنگ کرنا اس کی عادت ہے۔ اسی وجہ سے کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ جبکہ پپو بہت ہی اچھا اور سمجھدار بچہ ہے۔ پڑھنے میں دل لگاتا ہے، ممی اور پاپا سے ضد کرنا، انہیں پریشان کرنا اسے پسند نہیں ہے۔ مہذب اور تمیز دار بچے ایسے ہی ہوتے ہیں

اب تم بتاؤ کہ تم بلو بننا پسند کرو گے یا پپو؟

گرایا

محمد عمر احمد خان

پچاس کا نوٹ میری جیب میں تھا اور میں بہت خوش تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اسکول سے چھٹی ہونے والی تھی۔ میرے کان گھنٹی کی آواز پر لگے ہوئے تھے اور میں بڑی بے چینی کے ساتھ ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظریں دوڑا رہا تھا جہاں ابھی بارہ بجنے میں بھی پچیس منٹ باقی تھے۔

"شیخو! کھڑے ہو جایئے کیا پریشانی ہے آپ کو؟"

مس میرے سر پر آ کھڑی ہوئیں، یقیناً انہوں نے مجھے بار بار گھڑی میں جھانکتا پالیا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں مس! مجھے کوئی پریشانی نہیں!!" "اگر آپ پریشان نہیں تو بار بار گھڑی میں کیوں دیکھ رہے ہیں؟" مس نے پوچھا۔

"ٹائم دیکھ رہا تھا جی!" میں نے جواب دیا۔

"آپ کلاس میں پڑھنے آئے ہیں یا ٹائم دیکھنے؟"

"جی پڑھنے آیا ہوں۔" میں نے سر جھکا کر ادب سے کہا۔

"کیا کہیں جانا ہے؟" مس باقاعدہ جرح کرنے پر تلی ہوئی تھیں، لیکن ان کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

"جی ہاں! چھٹی کے بعد بازار جاؤں گا!" میں نے کہا۔

"بازار کس لئے؟" مس نے پوچھا۔

"وہ جی!..... میں انہیں بازار جانے کی وجہ بتانا نہیں چاہ رہا تھا اس لئے "وہ جی!" کہہ کر ہی خاموش ہو گیا۔

"شاید آپ بتانا نہیں چاہتے؟"

"نہیں مس! یہ بات نہیں۔" میں گڑ بڑا گیا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں جی!" میں اب بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"دیکھئے! اچھے شاگرد اپنے استادوں سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ آپ بھی ہم سے کوئی بات نہ چھپائیں۔" مس میرے کان کے قریب جھک گئیں۔ اتنے قریب کے ان کے کالے بالوں کے ریشے میرے گالوں کو چھونے لگے اور انہوں نے جو پرفیوم لگایا تھا اس کی خوشبو میرے ناک کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔

"وہ جی!..... اپنی بات بتانے کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے اور مس مجھ سے وہ بات اگلوانا چاہتی تھیں جسے میں سب سے چھپانا چاہتا تھا۔

"ہاں ہاں! بتا دو مجھے گھبراؤ نہیں!!" مس بڑے پیار سے میرے کان میں سرگوشی بھرے لہجے میں بولیں.....

"وہ جی!..... میں پریشان سا ہو گیا۔

"بازار جا کر کیا چاٹ کھاؤ گے؟" مس نے پوچھا۔

"نہیں جی!"

"اچھا! تو حلیم کھاؤ گے؟"

"نہیں جی!"

"مٹھائی والے کی دکان سے گرم گرم جلیبیاں کھاؤ گے؟"

"نہیں جی!"

"اچھا میں سمجھ گئی۔ آپ بازار میں دودھ کی ٹھنڈی بوتل پئیں گے؟"

مس نے اس دفعہ بڑے یقین سے کہا لیکن میرا جواب اس دفعہ بھی تھا۔

"نہیں جی!"

مس جھنجھلا کر ایک دم سے سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ شاید انہیں میری "نہیں جی" پر غصہ آ گیا تھا۔ وہ ناراضگی سے بولیں.....

"میں سمجھ گئی۔ آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے

ہیں!!!"

"نہیں مس!" میں مس کی ناراضگی سے ڈر گیا۔ اس لئے ڈر گیا کہ وہ میری استانی تھیں۔ بڑی محنت، اور لگن سے پڑھاتی تھیں۔ بری باتوں پر ٹوکتی تھیں اور اچھی باتوں پر شاباشی دیتی تھیں۔ مس کو تمام شاگردوں سے بہت محبت تھی۔ اور جب کوئی استاد شاگردوں سے اتنی محبت کرے تو شاگردوں کا فرض بھی بنتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اور پیارے استادوں کو ناراض نہ کریں۔

چنانچہ بڑی آہستگی سے میں نے مس کو بتا دیا کہ میں بازار جا کر گڑیا خریدوں گا۔

"ارے! آپ بازار جا کر گڑیا خریدیں گے؟" مس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے سر جھکا کر بڑی آہستگی سے کہا۔

"جی مس گڑیا خریدوں گا۔"

"اپنی چھوٹی بہن کے لئے؟"

"نہیں جی!"

"پھر کس کے لئے؟" مس کا لہجہ سوالیہ تھا بہت زیادہ سوالیہ۔

"اپنے لئے!!؟"

"جی اپنے لئے۔"

"آپ گڑیا سے کھیلیں گے؟"

"جی مس میں گڑیا سے کھیلوں گا۔ گھر میں میرے پاس بہت ساری گڑیائیں ہیں جن کے ساتھ میں کھیلتا ہوں۔"

"بہت ساری گڑیاؤں کے ساتھ کھیلتے ہیں!؟" مس کے لہجے میں بہت ہی زیادہ حیرت تھی۔ میری بات سن کر ساری کلاس ہنس پڑی۔ میں نے شرمندگی کے احساس سے سر جھکا لیا۔

میں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ کلاس میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ مس نے بچوں کو خاموش رہنے کو کہا پھر وہ میرے قریب آئیں۔ بڑے پیار سے میرے دونوں کاندھوں پر انہوں نے اپنے ہاتھ رکھے اور پھر بڑی نرمی سے انہوں نے پوچھا.....

"کیا واقعی! آپ گڑیاؤں کے ساتھ کھیلتے ہیں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مس نے پھر پوچھا.....

"گڑیا سے کھیلنا اچھا لگتا ہے کیا؟"

میں اب بھی خاموش رہا۔

مس بولیں.....

"لڑکے بالے کرکٹ کھیلتے ہیں، ہاکی اور فٹ بال سے لطف اٹھاتے ہیں۔

لیکن!"..... مس ایک لمحے کو خاموش ہوئیں پھر دوسرے ہی لمحے بولیں.....

"لیکن آپ کو گڑیا کے ساتھ کھیلنا اچھا لگتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں گڑیا کے ساتھ کھیلنا تو لڑکیوں کا کام ہے۔"

مس کی یہ بات سن کر میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میرا سر مارے شرم کے اور جھک گیا۔ کلاس میں سے کسی بچے نے آواز لگائی.....

"مس! یہ تو لڑکی ہے!!۔"

ایک نور آواز آئی.....

"لڑکیوں والے کھیل کھیلتا ہے!"

خاموش!!" مس کی آواز سنتے ہی کلاس میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

مس نے مجھ سے پوچھا.....

"آپ! مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ گڑیوں کے ساتھ کھیلنا آپ کو کیوں اچھا لگتا ہے؟"

مس گڑیوں کے ساتھ کھیلنے کی وجہ پوچھ رہی تھیں اور اب وجہ بتانا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ اگر وجہ نہیں بتاتا تو پورے اسکول میں "گڑیا کے ساتھ کھیلنے والی لڑکی" کے نام سے مشہور ہو جاتا اور چونکہ میں لڑکا تھا اور "لڑکی" کے نام سے مشہور نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے سر جھکا کر رندھی ہوئی آواز میں میں نے مس کو بتا دیا کہ میری ایک پیاری سی چھوٹی بہن تھی، معصوم بھولی بھالی سی، بالکل گڑیا کی طرح، جو ایک دن میرے ساتھ کھیلتے کھیلتے مر گئی اور مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ گئی ہے۔

"میرے پاس جب بھی پیسے ہوتے ہیں تو میں بازار جاتا ہوں اور کھلونوں کی دکان پر جا کر اس گڑیا کو خریدتا ہوں جس کی شکل میری بہن گڑیا میں مل رہی ہوتی ہے اور جب میں اسے خرید کر گھر لے آتا ہوں تو اپنی بہن گڑیا سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں رو پڑا۔ روتے روتے میں نے دیکھا کہ مس کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے!

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں... اگر آپ نے کلاس میں
پہلی پوزیشن
دوسری پوزیشن
یا
تیسری پوزیشن
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی
ادارے کے سربراہ سے کروا کے اور ہمیں
بھجوا دیجئے؛
ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ

آنکھ مچولی

1- بی آئی بی کالونی، کراچی ۵

اللہ بچائے

میما صدیقی

ہمارا قصور بس اتنا ہی سا تھا کہ ہمارے دانتوں میں کچھ عرصے سے تکلیف تھی۔ پہلے تو ہم اسے ٹالتے رہے مگر پھر شامت جو آگئی تو ہم نے "اسپیشلسٹ ڈاکٹر" کے مطب کا رخ کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے گیدڑ کی شامت آئے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ گیدڑ کو تو شاید شہر والے بخش بھی دیں، مگر مریض کو اسپیشلسٹ نہیں بخشتا۔ پھر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے مصداق اس کا معمولی مرض خوفناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی درد، دردِ لادوا، بن جاتا ہے۔ اسپیشلسٹ کے پاس پہنچ کر انکشاف ہوتا ہے کہ دنیا

کی تمام عجیب و غریب، مشکل ناموں والی خطرناک بیماریاں اس کو لاحق ہو چکی ہیں یا عنقریب ہونے والی ہیں۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر چونکہ فیس اسپیشل قسم کی لیتا ہے اس لئے وہ کوئی "عامیانہ" سی بیماری تو تشخیص کرنے سے رہا، چنانچہ وہ ایسی بیماری ڈھونڈ نکالتا ہے جس کا نام سن کر آدمی سن رہ جائے، اور کہیں جائے پناہ نہ پائے۔

یہ ڈینٹل کلینک جہاں جانے کا جرم ہم سے سرزد ہوا، ایک ہسپتال میں واقع تھا۔ سلائڈنگ ڈور کھول کر جب ہم "کلینک" میں داخل ہوئے تو کیا دیکھا کہ ایک جہازی سائز میز کے عقب میں ایک مختصر مگر خوش رو خاتون بیٹھی ہیں۔ "مسکراہٹ سب کے لئے" شاید ان کا سلوگن تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اسسٹنٹ تھیں اور جائے واردات پر بطور چشم دید گواہ موجود رہتی تھیں۔ ویٹنگ روم کے آگے، کمرے کے دو پارٹیشن کر دیئے گئے تھے، تاکہ بیک وقت دو مریضوں کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب بھی نہایت خوش وضع، خوش گفتار اور خوش اخلاق قسم کے آدمی تھے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس خوش کن ماحول میں ہمارے ساتھ کوئی خوفناک کھیل کھیلا جائے گا۔

یہ بجا ہے کہ ابتدائی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے ایک نہایت خوفناک قسم کا انجکشن ٹھونک کر ہمارا دانت سن کر دیا تھا، مگر ہماری آنکھیں اور دماغ سن نہیں ہوئے تھے۔ ہم بدستور ہوشیار باش تھے اور بخوبی دیکھ اور سمجھ رہے تھے کہ چار پانچ مختلف رنگوں کے ہتھوں والی باریک سوئیاں یکے بعد دیگرے ہمارے دانت کے سوراخ میں ڈال کر ڈاکٹر ہمارے دانت کی جڑیں کھود رہے ہیں شاید اس گڑھے میں بھی کوئی پودا لگانے کا ارادہ تھا۔ اس تخریب کاری کے ساتھ وہ مصروف گفتگو بھی تھے یہ نفسیاتی حربہ تھا کہ مسلسل باتوں میں لگائے رکھنے سے مریض کو تکلیف کا احساس نہ ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی آپ کی کھدائی کر رہا ہو تو آپ کا ذہن کیسے بٹ سکتا ہے۔ (ہاں! دانت ضرور بٹ سکتا ہے، ٹکڑوں کی صورت میں) وہ دوران گفتگو وقتاً فوقتاً ہمارے ضبط کا امتحان لینے کے لئے یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ "درد تو نہیں ہوا؟" ہم نفی میں سر ہلاتے رہے گویا کہہ رہے ہوں کہ ۔ درد اتنا نہیں کہ تم سے کہیں۔ گو کہ حقیقت تو یہ تھی کہ ضبط کا پیمانہ لبریز تھا، دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رونا شروع کر دیں اور چیخ چیخ کر اس ولایت پلٹ ڈاکٹر کے باہر بیٹھے سارے مریضوں کو بھگا دیں مگر ایک تو حد ادب ملحوظ رہی دوسرے یہ کہ ان ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ جب وہ کسی مریض کا دانت نکالتے ہیں یا دانتوں کی بھرائی (فلنگ) کرتے ہیں، تو اس خوبی سے کہ کسی کو کانوں کان اور مریض کو دانتوں دانت خبر نہیں ہوتی۔ اور اس دعویٰ کو غلط ثابت کر کے ہم ان کی دشمنی مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے کیونکہ اس وقت ہم مکمل طور پر ان کے ہتھیار نما اوزاروں کی زد میں تھے۔

بند کی بنیاد موٹی کیوں؟

ندیم میرا بھتیجا ہے۔
پچھلے جمعہ کو ہم لوگ حب ڈیم کی سیر کو گئے تو

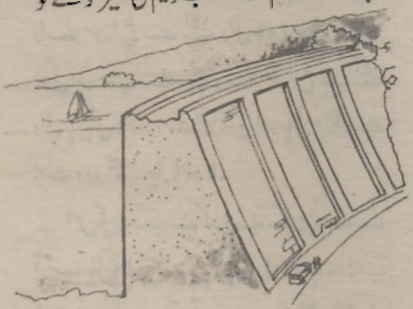

حسب عادت ندیم نے مختلف چیزوں کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک سوال، جس

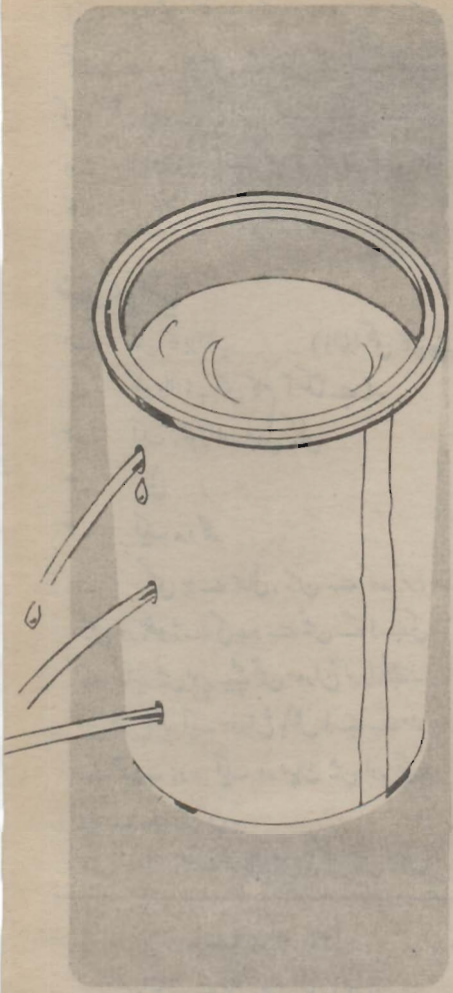

کے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہو سکا، یہ تھا کہ بند بنیاد کی طرف اتنا موٹا کیوں ہے اور چوٹی کی طرف اس کی موٹائی کم کیوں ہے۔ میں نے بتایا کہ اس کی وجہ پانی کا دباؤ ہے مگر بات اس کی سمجھ میں نہیں

پانچ منٹ بعد انہوں نے ہمارے مسوڑھے میں اندر کی جانب ایک بلیڈ نما چیز گھسیڑ دی۔ کہا کہ ہم انگلی سے اسے دبائے رکھیں، تکلیف کے مارے جان ہی نکل گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ دانت کا ایکسرے لیا جارہا ہے، ڈاکٹر نے حسب عادت مسکرا کر پوچھا "درد تو نہیں ہوا؟" دل تو چاہا کہ پوچھوں ڈاکٹر صاحب آکر کوئی آپ کے بتیس دانت نکال کر آپ کے ہاتھ پہ رکھ دے اور پھر پوچھے "درد تو نہیں ہوا؟" تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ عموماً ڈاکٹر بڑے سنجیدہ اور خشک طبع سے ہوتے ہیں مگر یہ ڈاکٹر صاحب نجانے عجیب ہی تھے کہ بات بے بات مسکرائے جارہے تھے، خواہ مریض کی جان پہ بنی ہو، یہی سبب سمجھ میں آیا کہ چونکہ دانتوں کے ڈاکٹر ہیں لہٰذا مسکرا مسکرا کر دکھا رہے ہیں کہ دیکھو میرے دانت کتنے آب دار، خوبصورت اور صحت مند ہیں۔

اگلے وزٹ پر انہوں نے نئے سرے سے ہمارا منہ کھلوانے کی کوشش کی، منہ کھولیں..... اور کھولیں..... بڑا سا ہاں..... شاباش! معلوم نہیں ڈاکٹر ہمارا منہ آخری حد تک کیوں کھلوانا چاہ رہے تھے شاید اندر جاکر معائنہ کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال ہمارا منہ اتنا ضرور کھل گیا کہ انہوں نے دست پناہ جیسا کوئی اوزار گھسا دیا اور دانت کو زور زور سے ٹھونک بجاکر دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی سوال کیا "یہ دانت ہل تو نہیں رہا.....؟" "جی نہیں.....! جب گھر سے چلے تھے اس وقت تو نہیں ہل رہا تھا..... اب کچھ کہہ نہیں سکتے....." "ہونہہ!" ڈاکٹر نے ہنکارا بھرا پھر دانت پر ایک ضرب شدید لگا کر بولے "درد تو نہیں ہوا؟" یہ ان کا تکیہ کلام تھا لہٰذا ہم نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

تیسری نشست میں انہوں نے اسکرو ڈرائیور اور شاور نما اشیا کی مدد سے تمام دانتوں کی دھلائی کی، کلیوں کی صورت میں ہمارا خون ناحق بہتا رہا۔ پھر متاثرہ دانت کی مزید کھدائی اور رگڑائی شروع کی تو دل میں آیا کہ اب گھر کی طرف دوڑ لگا دیں اور پلٹ کر نہ دیکھیں، مگر انہوں نے ایسا گڑھا کھود ڈالا تھا جیسے میونسپلٹی کے آدمی سڑک کھود کے ڈال جاتے ہیں چنانچہ اب گڑھے کو تو بھروانا ہی ٹھہرا۔ یہ ڈاکٹر کی مہارت تھی کہ اس نے محض ایک چھید (ہول) کو کھود کر گڑھے میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس نے گڑھے میں مختلف انواع کے اسپرے کئے اور فرمایا "اب اس کے نزدیک زبان نہ لائیے گا"۔ "تو پھر زبان کو کہاں رکھیں؟" ہم نے قدرے جھنجھلا کر استفسار کیا۔ "میرا مطلب ہے زبان کو منہ میں ہی رکھیں مگر زبان سے اس دانت کو نہ چھوئیں۔" ڈاکٹر نے گڑبڑا کر وضاحت کی، اب ہمیں اپنے دانت میں ایسا ہی خلا محسوس ہو رہا تھا جیسا خلا مشہور لوگوں کے دنیا سے جانے کے بعد سوسائٹی میں پیدا ہو جاتا ہے جو بقول لوگوں کے کبھی نہیں بھرتا۔

چلتے وقت ڈاکٹر نے روئی کو بالکل کافور جیسی دوا میں بھگو کر ہمارے گڑھے میں گھسا دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ سرجن تھے اور دانت نکالنے کا گر ولائت سے سیکھ کر آئے تھے، چنانچہ وہ دانت ٹھیک کرنے سے زیادہ دانت نکال پھینکنے میں انٹرسٹڈ نظر آتے تھے، یعنی دندان ساز سے زیادہ دندان شکن واقع ہوئے تھے۔ دانت نکالنے کا انہیں بچپن سے ہی شوق معلوم ہوتا تھا۔ ابتدا میں مکامار کر دانت پیٹ میں اتار دیتے ہوں گے اب اسی کام کو سائنٹیفک انداز میں کر رہے تھے، دانت کے سبھی معالج دواؤں کے بجائے اوزاروں کا استعمال زیادہ پسند کرتے ہیں۔

دانتوں کا ڈاکٹر شاید وہ واحد ڈاکٹر ہے جس کے ہاتھوں کوئی مریض فوت نہیں ہوتا۔ ہاں! قلاش ضرور ہو سکتا ہے۔ اب ان ہی ڈاکٹر صاحب کو لیجئے۔ دو سو روپے صرف ایک دانت کے ایکسرے کے رکھوا لیتے ہیں۔ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون کون سے دانت ہیں جنہیں وہ آسانی سے اکھیڑ سکتے ہیں حالانکہ یہ معلومات صرف ان ہی کے کام آتی تھیں مگر ایکسرے کے پیسے وہ مریض کی جیب سے ہی نکلواتے ہیں۔ فیس کے اعتبار سے بھی دانت نکالنا ان کے لئے زیادہ پرکشش کام تھا۔ کام اس قدر آہستہ روی سے کرتے کہ پہلی نشست میں صرف اپنے دانتوں کی نمائش کرتے، دوسری میں مریض کے دانت دیکھتے اور تیسری نشست میں مختلف اوزار لے کر وہ دانتوں پہ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ (اور دانت ٹوٹ کر ان پر گرتے ہیں)

چلتے وقت ڈاکٹر صاحب نے ہمیں ایک ماؤتھ واش، بھی لکھ کر دیا۔ فرمایا کہ "دن میں دس پندرہ مرتبہ اس سے کلیاں کریں..... ہر چند کے ہمیں دن بھر میں کلیاں کرنے کے علاوہ بھی بہت سے کام ہوتے ہیں مگر ڈاکٹر کا دل رکھنے کے لئے ہم نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا، اگر ہم ان کا دل نہ رکھتے تو شاید وہ ہمارے دانت ہی رکھ لیتے۔

ہم نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب اور کتنی مرتبہ آنا پڑے گا۔" ڈاکٹر صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولے بس چند سٹنگ اور چلیں گی۔ ہم بہت جزبز ہوئے کہ آخر وہ دندان ساز بھی تو ہوتے ہیں جو صدر کے فٹ پاتھ پر ایک ہی سٹنگ میں مریض کا کام تمام کر دیتے ہیں اور کچھ تو زنبور لے کر بس میں چڑھ جاتے ہیں اور ان کو سٹنگ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، کھڑے کھڑے پندرہ روپے میں دانت نکال کر ہاتھ پہ رکھ دیتے ہیں۔

خیر جناب بس میں گھومنے والے دندان ساز ہوں یا ایئر کنڈیشنڈ کلینک میں بیٹھنے والے، دونوں میں ایک بات ضرور مشترک ہے کہ یہ اپنی طرز کے واحد اسپیشلسٹ ہوتے ہیں جو کسی عضو کو ٹھیک کرنے کے بجائے اسے نکال پھینکنے میں دلچسپی اور مہارت رکھتے ہیں۔ شکر ہے کہ ای این ٹی اسپیشلسٹوں میں یہ خطرناک رجحان نہیں پایا جاتا ورنہ لوگ بینائی کا علاج کرانے جاتے اور آنکھ نکلوا کر آجاتے، ناک

کا مسئلہ ہوتا تو ناک کٹوانی پڑتی، شاید سری لنکا میں یہی رواج ہو جبھی وہاں کے باشندوں کے ڈھیروں آنکھیں ادھر ادھر گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے جو آنٹی رہتی ہیں انہوں نے جو ہمیں دندان ساز کے در کے چکر کاٹتے دیکھا تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہولیں۔ کہنے لگیں "بیٹا دانت میں تکلیف ہے، ٹھنڈا گرم بھی لگتا ہے"۔ ہم نے دل میں کہا "علاج کے بعد آپ کو ٹھنڈا گرم کچھ نہیں لگے گا کیونکہ دانت ہی نہیں ہوں گے"۔

آنٹی کے دانتوں کا ابتدائی معائنہ کرتے ہی ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی!"

عام طور پر فلموں میں یہ ڈائیلاگ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی فوت ہو جائے۔ "افسوس! لوگ اپنے دانتوں پر بالکل توجہ نہیں دیتے، مٹھائی، کیک، چاکلیٹ پان سگریٹ کھاپی کہ سو رہتے ہیں۔ دانت برش کرتے بھی ہیں تو طریقہ صحیح نہیں ہوتا۔ درد ہو تو فوری علاج نہیں کراتے۔ جب دانت بالکل تباہ ہو جاتے ہیں، تو پھر ڈینٹسٹ کا رخ کرتے ہیں۔ نتیجتاً دانت نکال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا..... حالانکہ ہر نارمل آدمی کو بھی سال میں دو مرتبہ ڈینٹسٹ سے دانتوں کی صفائی کرانی چاہئے۔" ڈاکٹر صاحب نے سانس لینے کے لئے قدرے توقف فرمایا پھر بولے "آپ کی ایک داڑھ بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اس میں انفیکشن بھی ہے۔ باقی دانتوں میں بھی کیڑا لگ گیا ہے"۔ آنٹی نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا تو ہم نے ان کے ہاتھ پہ تھپکی دی، گویا کہہ رہے ہوں "آنٹی آپ فکر نہ کریں، ان کی یہی بری عادت ہے ہر ایک کے دانتوں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں"۔

"اس دانت کو نکالنا پڑے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے دانت کھٹکھٹاتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ آنٹی سوچ میں گم ہو گئیں کہ کیا فیصلہ کریں۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب مصروف رہے، دس منٹ بعد بولے "اب درد نہیں ہو گا۔" آنٹی نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں؟" "اس لئے....." ڈاکٹر صاحب نے ٹرے میں پڑا ہوا آنٹی کا دانت فخر سے دکھایا گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھا مریض کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، پھر حسب عادت پوچھا "درد تو نہیں ہوا؟" آنٹی نے ٹرے میں پڑے دانت کو دیکھا اور غمناک لہجے میں بولیں "نہیں..... دکھ ہوا"۔

ارے! ایسی کیا بات ہے، آپ کہیں تو ہم آپ کے دوسرے دانت لگا دیں گے۔ بلکہ ہم تو پورا جبڑا بھی تبدیل کر دیتے ہیں..... نیا جبڑا لگا دیتے ہیں"۔

۲۶۸ بلین (دو ارب اسی کروڑ) مرتبہ دھڑکتا ہے۔ اس دوران میں وہ ۲۷۲۶۷۶ ملین (۲۷ کروڑ ۲۷ لاکھ ساٹھ ہزار) لیٹر خون پمپ کرتا ہے۔

انسانی جسم کو پانی کا ذخیرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم کے مجموعی وزن کا ۶۵ فیصد اس کے جسم میں موجود پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک بالغ شخص کے جسم میں تقریباً ۴۵ لیٹر پانی ہوتا ہے

انسانی جسم کا سب سے بڑا عضو (ORGAN) دراصل اس کی کھال کو کہا جاسکتا ہے۔ ایک بالغ مرد کے جسم کی مجموعی کھال ۲۰ مربہ فٹ اور بالغ عورت کی ۱۷ مربع فٹ ہوتی ہے۔

سونے کے دوران، انسان کا قد، اس کے اصل قد سے ۳ انچ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن صبح کے بعد وہ کم ہو کر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دن میں کھڑے ہونے یا بیٹھنے کے دوران ریڑھ کی ہڈی کے مہرے، کشش ثقل کے سبب اسفنج کی طرح دب جاتے ہیں۔ لیکن رات کے وقت جب انسان سونے کے لئے لیٹتا ہے تو وہ دباؤ کم ہو جاتا ہے اور مہرے دوبارہ پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر جب خلا باز، خلا میں لمبے سفر کے بعد واپس آتے ہیں تو ان کے قد میں عارضی طور پر دو انچ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

انسانی آنکھ کے پچھلے حصے میں ایک ملائم محدب بناتا ہے اسے پردۂ چشم (RETINA) کہتے ہیں۔ اس کا رقبہ صرف ایک مربع انچ ہوتا ہے لیکن اس میں روشنی سے متاثر ہونے والے تقریباً ۱۳۰ ملین (۱۳ کروڑ) سیل ہوتے ہیں۔

انسانی جسم پر موجود بالوں کی تعداد گننا آسان نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی مجموعی تعداد پچاس لاکھ ہوتی ہے۔ سر پر اسی ہزار سے لے کر ایک لاکھ پچیس ہزار بال ہوتے ہیں۔ ہر مہینے تقریباً ۴ انچ بال بڑھتے ہیں۔ موسم بھی بالوں کی افزائش پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سردی کے مقابلے میں گرمی میں بال زیادہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔ عام حالات میں بال گرنے اور نئے بال پیدا ہونے کا عمل ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ ایک عام شخص کے روزانہ تقریباً ایک سو بال گرتے اور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بال کی زیادہ سے زیادہ زندگی مرد کے لئے چار یا پانچ سال اور عورت کے لئے پانچ یا چھ سال ہوتی ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کے بال زیادہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔ قدرت نے عورت اور مرد کے جسم کی ساخت مختلف رکھی ہے عورت کے جسم میں مرد کے برعکس کچھ ہارمونز مختلف ہوتے ہیں اسی لئے مرد تو گنجے ہو سکتے ہیں لیکن خواتین نہیں ہوتیں۔ ایک عام شخص اپنی پوری زندگی کے دوان تقریباً پچاس ٹن غذا کھاتا ہے اور ساٹھ ہزار لیٹر سے زیادہ مائع پیتا ہے۔

گونج

عبدالسلطان

میں جو کہانی آپ کو سنانے والا ہوں، یہ بہت پرانے زمانے کی ہے۔ اتنے پرانے زمانے کی جب گاڑیاں، ٹی وی، کمپیوٹر، بجلی اور ٹیلی فون کچھ بھی نہیں تھا اور جب اس دنیا میں انسانوں کے درمیان پری زاد بھی رہتے تھے۔

تو بچو! ایک پری جس کا نام "گونج" تھا، بہت ہی حسین اور کم عمر، سارا سارا دن تنہا کھیلتی رہتی تھی۔ اس کی کوئی سہیلی نہ تھی۔ پھر بھی وہ بہت زیادہ باتونی تھی اور سارا وقت باتیں کرتی رہتی۔ بے مقصد اور بغیر تھکے، جس طرح چڑیا شاخ پر بیٹھتی اور پھدک پھدک کر سارا سارا دن چہچہاتی رہتی ہے اور تھکنے کا نام نہیں لیتی۔

اس زمانے میں پری زادوں کی ملکہ "جونو" نامی ایک بہت ظالم اور مکار جادوگرنی تھی۔ اسے "گونج" کا کھیلنا کودنا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ گونج کی خوشی اور بے فکری پر بہت جلتی تھی۔ چنانچہ ایک روز اس نے گونج کو سزا دینے کا منصوبہ بنایا اور اسے اپنے محل میں بلایا۔

"تم بہت شریر اور بدتمیز ہو۔ سارا سارا دن باتوں اور قہقہوں سے لوگوں کے کان تھکا ڈالتی ہو۔ تمہیں اس کی سزا ملنی چاہئے۔" ملکہ جونو نے گونج سے کہا۔ "تمہاری سزا یہ ہے کہ میں تمہاری آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گی اور تم جو

کچھ سنو گی، صرف اس کے آخری ایک دو حرف دہرا سکو گی۔ خود سے ایک لفظ بھی نہ بول سکو گی۔"

گونج نے حیرت اور خوف سے ظالم ملکہ کی باتیں سنیں اور آہستہ سے کہا۔ "بول سکو گی۔"

ملکہ نے اپنا جادو کامیاب ہوتا دیکھ کر مکاری سے مسکرا کر کہا۔ "اب تم دفع ہو جاؤ۔"

"دفع ہو جاؤ" گونج نے ملکہ کے آخری حرف دہرائے اور محل سے بھاگ ایک گھنے جنگل میں روپوش ہو گئی۔

اب بیچاری گونج اپنے گھر اور اپنے والدین کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ وہ اب باتیں بھی نہیں کر سکتی تھی، اس لئے لوگوں سے چھپنے کی خاطر اس گھنے جنگل میں آچھپی اور یہیں پر اکیلی اپنی زندگی بسر کرنے لگی۔

ایک روز اس جنگل سے ایک لڑکے کا گزر ہوا۔ وہ لڑکا بے حد حسین تھا۔ اس کے بال چنار کے خشک پتوں کی طرح سرخ تھے۔ اس کے رخسار سیب کی طرح سرخ اور تازہ تھے اور اس کی آنکھیں آسمان کی طرح نیلی تھیں۔ وہ تیر کمان ہاتھ میں پکڑے شکار کرتے ہوئے ادھر آنکلا تھا۔ گونج نے جب اس لڑکے کو دیکھا تو وہ اسے بہت پسند آیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی لیکن درختوں کی اوٹ لیکر، تاکہ وہ اسے دیکھ نہ سکے۔ گونج اس کے سامنے اس لئے نہیں آنا چاہتی تھی کہ کہیں اسے پتہ نہ چلے کہ وہ کچھ بھی نہیں بول سکتی۔

وہ حسین لڑکا جب تھک گیا تو اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ رک کر وہ زور سے چیخا، "دوستو تم کہاں ہو؟"

"کہاں ہو؟" اسے قریب ہی سے ایک بہت خوبصورت اور سریلی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا گیا کیونکہ وہاں اسے کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا، "تم کون ہو؟"

"کون ہو؟" پھر وہی سریلی آواز آئی لیکن کوئی نظر نہ آیا لڑکا سخت حیرت میں پڑ گیا اور دوڑ دوڑ کر ایک ایک درخت کے پیچھے اسے تلاش کرنے لگا جو اسے جواب دینے کی بجائے چھپ کر صرف اس کے آخری الفاظ کو دہراتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے۔

آخر کار جب وہ بہت تھک گیا تو ایک تناور درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور ہانپتے ہوئے چیخا۔ "تم کون ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"کیوں نہیں دیتے؟" گونج نے اس لڑکے کے الفاظ دہرائے اور ایک درخت کی اوٹ سے باہر نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ وہ منہ سے اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو۔ اس لئے وہ دوڑ کر مسکراتے ہوئے اس حسین لڑکے کے سامنے آگئی۔

پیارے بچو! ، میں یہ بتانا بالکل ہی بھول گیا تھا

بوتلوں کے مکان

وادی سیمی کی ایک خاتون ٹریسا کی عمر ۶۲ سال تھی اس نے ناکارہ بوتلوں کا شیشہ استعمال کر کے ۱۳ خوبصورت گھر تعمیر کئے..... ان تیرہ مکانات کی تیاری میں اس نے کسی شخص کی مدد حاصل نہ کی بلکہ سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔

بلیوں کی کمانڈر

بروکلین نیو یارک کی ریٹا کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا ۱۹۲۶ء میں ایک ہی دن میں نیو یارک ہیومن سوسائٹی کو ۱۵۰۰ جنگلی بلیاں فراہم کی تھیں۔

جہاز سے اخبار کی سپلائی

کیلیفورنیا میں سارہ بوسٹر اخبار کا مالک ۷۲ سالہ ہال رائٹ اپنا اخبار اپنے ہوائی جہاز سے اپنے گاہکوں تک پھینکتا تھا۔ وہ اس کام میں اتنی مہارت رکھتا تھا کہ اس کا اخبار ہمیشہ پڑھنے والے کے دروازے کے سامنے گرتا۔

مرسلہ..... وقاص بن حسین، بہاول پور۔

کہ یہ لڑکا جتنا زیادہ حسین اور خوبصورت تھا اتنا ہی بد دماغ، چڑچڑا اور مغرور تھا۔ کسی سے دوستی نہ کرتا تھا اور نہ ہی کسی سے مسکرا کر ملتا نہ پیار سے باتیں کرتا۔ اسے دنیا میں صرف اور صرف ایک ہی ذات سے محبت اور پیار تھا۔ آپ جانتے ہیں وہ کون تھا، جس سے اس بد مزاج لیکن خوبصورت لڑکے کو محبت تھی؟ وہ تھا اس کا اپنا آپ، یعنی اسے تمام دنیا میں فقط اپنے آپ سے محبت تھی۔ اپنے سوا وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اسے اس بد مزاجی اور چڑچڑے پن کی کیا سزا ملی؟ یہ میں آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔

تو جناب اس لڑکے نے گونج کو دھکا دے کر پیچھے گرا دیا اور خود اسے اکیلا جنگل میں چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کی تلاش میں چلا گیا۔

گونج بیچاری بہت غمگین ہوئی۔ سارا دن روتی رہی۔ وہ اب پھر تنہا ہو گئی تھی۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے گی چنانچہ وہ بھاگ کر گھنے جنگلوں کے تاریک حصوں اور اندھیرے غاروں میں روپوش ہو گئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی۔ اس دن کے بعد کسی انسان نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ بہت افسردہ رہتی۔ اس نے کھانا کھانا بھی چھوڑ دیا تھا، اور ہر وقت روتی رہتی۔ چنانچہ وہ دن بدن کمزور ہو گئی اور آخر کار ایک دن وہ خوبصورت، شوخ و چنچل اور خوش مزاج پری گونج مر گئی۔

پیارے بچو! یوں اس لڑکے کی بد مزاجی اور چڑچڑے پن کی وجہ سے گونج تو تنہائی میں مر گئی لیکن اس کی آواز نہیں مری۔ اس کی آواز زندہ رہ گئی اور آج بھی زندہ ہے۔

آج بھی اگر آپ ان گھنے اور تاریک جنگلوں اور غاروں میں جا کر اسے پکاریں گے تو وہ آپ کے آخری الفاظ دہرائے گی۔

"مم..... مگر نیا جبڑا آپ لاتے کہاں سے ہیں؟" ہم نے لاشعوری طور پر اپنے جبڑے پر ہاتھ پھیرا۔

"اوہو! بھئی ہم نقلی جبڑا تیار کروالیتے ہیں۔ دانتوں کے کیپ (خول) بھی بنوالیتے ہیں"۔ ہمیں تو ڈر تھا کہ ڈاکٹر صاحب دانتوں کی کلیرنس سیل کا اعلان نہ کر دیں کہ چھ دانت نڑوانے پر ایک درجن دانتوں کا سیٹ مفت حاصل کریں۔

جب ہم آنٹی کے ہمراہ باہر نکلے تو وہاں ایک محترمہ تھیں۔ انہوں نے کچھ بات کی تو ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کے منہ میں ایک دانت نہ تھا۔ ہم حیران تھے کہ اس کم عمری میں ان کے دانت کہاں گئے؟ ہم نے تعزیتی انداز میں پوچھا "آپ کے دانت کہاں ہیں؟" انہوں نے پرس تھپتھپا کر کہا "اس میں....." ہمیں ان کے حال میں اپنا مستقبل واضح طور پر نظر آنے لگا۔

آخری نشست میں ڈاکٹر صاحب نے ہمارے دانت کی ڈرلنگ شروع کی، مگر اس سے قبل سوئی کو نہایت گہرائی میں لے جا کر کھرچائی کی، اس قدر تکلیف ہوئی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھ سے آنسو رواں ہو گئے۔ شکر ہے اس موقع پر ڈاکٹر نے "درد تو نہیں ہوا؟" کا دردناک تکیہ کلام استعمال نہیں کیا۔ جب کام ختم ہوا تو ڈاکٹر نے اپنے مخصوص لیکچر کی تمہید باندھتے ہوئے کہا "اس ساری تکلیف سے آپ کو کیا سبق ملا؟"

"یہی کہ آئندہ کبھی ڈینٹل سرجن کا رخ نہ کریں"۔

ڈاکٹر صاحب بشاشت سے مسکرائے گویا ہم نے ان سے مذاق فرمایا ہو۔

ڈاکٹر نے اپنی میز کی طرف آتے ہوئے کہا "آپ کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہیں"۔

ہم نے ٹوتھ پیسٹ کا نام لیا تو فرمایا "آج ہی اسے گٹر میں پھینک دیں....."

"اور صبح نکال لیں!" ہم نے ذہانت کا مظاہرہ کیا۔

"جی نہیں! صبح یہ ٹوتھ پیسٹ خرید کر استعمال کرنا شروع کر دیں"۔

انہوں نے نسخہ ہماری جانب بڑھاتے ہوئے کہا "باقاعدگی سے چیک اپ کراتی رہیں۔ ماؤتھ واش کا استعمال جاری رکھیں۔ کیونکہ اگر پھر انفیکشن ہو گیا تو یہ دانت نکالنا پڑے گا....."

یہ سنتے ہی ہم بھڑک کر باہر کی طرف بھاگے اور ڈاکٹر کی الوداعی مسکراہٹ بھی نہ دیکھ پائے۔ انتقال کے بعد جب ان ڈاکٹر صاحب کی تدفین ہوگی تو دوسرے ہی روز آس پاس کے مردے قبر پھاند کر نکل بھاگیں گے، کہ برابر والا مردہ ہمارا دانت نکال رہا ہے، اللہ ہر زندہ اور مردہ کو ڈینٹل سرجن سے بچائے، اور بہتر ہے کہ مریض ڈاکٹر کو پیارا ہونے کے بجائے اللہ کو پیارا ہو جائے۔

انسانی جسم

آپ کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہئے۔

انسانی جسم قدرت کا ایک عجوبہ ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ ساخت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختصر سے انسانی جسم کو ایسی نعمتیں عطا کی ہیں جن کو دیکھ کر یا ان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے عقل حیران رہ جاتی ہے کہ واقعی انسان اشرف المخلوقات ہے۔

انسانی دماغ ہزار ہا کمپیوٹر کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک سو بیلین (ایک کھرب) نیوران (یعنی اعصابی سیل) ہوتے ہیں انسانی دماغ کا وزن، جسم کے مجموعی وزن کا صرف دو فیصد ہوتا ہے لیکن اس کی کارکردگی حیرت انگیز ہے۔ ہم سانس کے ذریعے اپنے جسم میں آکسیجن داخل کرتے ہیں، اس کا تقریباً بیس فیصد، دماغ اپنے کام میں لے لیتا ہے۔ ہم جو غذا کھاتے ہیں، اس میں موجود بیس فیصد حرارے (CALORIES) دماغ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح یہ جسم کی کل پندرہ فیصد خون کی سپلائی اپنے استعمال میں لاتا ہے۔

ایک بالغ انسان کا جسم تقریباً ۶۵۰ عضلات یا پٹھوں (MUSCLES) ایک سو سے زیادہ جوڑ (JOINTS) اور تقریباً پچاس ہزار میل لمبی خون کی شریانوں اور رگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

پیدائش کے وقت ایک بچے کے جسم میں کل ۳۰۰ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ بچپن کے دوران میں ۹۴ ہڈیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اس طرح ایک بالغ شخص کا جسم ۲۰۶ ہڈیاں پر مشتمل ہوتا ہے ان ہڈیوں میں سے تقریباً آدھی اس کے ہاتھوں اور پیروں میں ہوتی ہے۔

انسانی ہڈیوں میں بہت زیادہ قوت ہوتی ہے۔ ہڈیوں کے ذریعے دیگر کئی اشیا سے مقابلتاً زیادہ وزن کو سہارا دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ماچس کی ڈبیا کے سائز کی انسانی ہڈی با آسانی دس من وزن اٹھا سکتی ہے جو کہ کنکریٹ کے مقابلے میں چار گنا زیادہ

آئی۔ لہٰذا گھر آنے کے بعد میں نے ایک تجربے کے ذریعے اس کے سوال کا جواب سمجھانے کی کوشش کی۔ یہاں اس تجربے کے بارے میں بیان کرتا ہوں۔ آپ بھی یہ تجربہ ضرور کیجئے گا۔

ضروری اشیا

۱۔ ٹین کا بڑا ڈبہ..... (ڈالڈا گھی کا پانچ کلو والا ڈبہ بھی کام آسکتا ہے)۔

۲۔ ایک ہتھوڑا اور موٹی کیل

۳۔ پانی

۴۔ ایک مددگار

۱۔ کسی بڑے بھائی، بہن سے کہہ کر، کیل اور ہتھوڑے کی مدد سے ٹین کے ڈبے کی ایک سائیڈ میں اوپر نیچے تین سوراخ کروالیجئے۔ اس طرح کہ ایک سوراخ بالکل ڈبے کے منہ کے قریب ہو۔ ایک درمیان میں اور ایک پیندے سے ذرا اوپر۔

۲۔ اس ڈبے کو باغیچے میں یا صحن میں جہاں پانی کے پھیلنے سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو، رکھ دیجئے اور ڈبے کو پانی سے لبالب بھر دیجئے۔

آپ دیکھیں گے کہ ڈبے کے تینوں سوراخوں سے پانی کی دھاریں نکلنا شروع ہوجائیں گی۔ سب سے اوپر والے سوراخ سے نکلنے والی دھار سب سے ہلکی ہوگی۔ درمیان والے سوراخ سے نکلنے والی اس سے ذرا تیز ہوگی اور سب سے نیچے والے سوراخ سے نکلنے والی پانی کی دھار بہت تیز ہوگی اور پانی پریشر سے بہت دور تک جارہا ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈبے کے پیندے کے قریب پانی کا دباؤ سب سے زیادہ ہے۔ جب کہ ڈبے کے منہ کے قریب یہ دباؤ بالکل معمولی ہے۔ ڈیم بناتے وقت بھی یہی اصول سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس لئے بند کو بنیاد کی طرف سے بہت مضبوط اور موٹا بنایا جاتا ہے جب کہ چوٹی کی طرف اس کو اتنا موٹا بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہاں پانی کا دباؤ بالکل معمولی ہوتا ہے۔

حساب برابر ہوا

مرزا غالب کے خاص خاص شاگرد اور دوست، جن سے ان کی نہایت بے تکلفی تھی، اکثر شام کو ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ مرزا اس وقت بہت پرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز ان کے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی ان کے پاؤں داب رہے تھے۔

مرزا نے کہا، بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے؟ انہوں نے نہ مانا اور کہا، "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پھر دابنے کی اُجرت دے دیجئے گا۔" مرزا نے کہا، "ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔" جب میر مہدی پیر داب چکے تو انہوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا، "بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہوا۔" مرسلہ..... اظہر محمود۔ ضلع چکوال

SUPER CRISP
Snacks for all seasons
مزے مزے کے چپس، دال مونگ، پی نٹس، نمکو مکس اور اب بادام بھی
حفظانِ صحت کے مطابق
ملاوٹ سے پاک
بین الاقوامی معیار کے مطابق
WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY
SUPER CRISP
PEANUTS
DAL MOONG
ALMONDS
FRIED & SALTED
Tripple Em (Pvt) Ltd.
72/C-I Gulberg III, Lahore. Pakistan
Ph: 871672 - 876396 - 876797
Telex: 44925 MALIK PK
Fax: 042-870-965

تلخیص و ترجمہ : ش م خالد

دُنیا کی
سب سے پست قامت خاتون

موجودہ زمانے کی سب سے پست قامت خاتون MADGE BESTER ہیں۔ ان کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے، یہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۳ء کو جوہنسبرگ میں پیدا ہوئیں۔ اس وقت ان کا قد ساڑھے پچیس انچ ہے۔

پست قامت مرد

بھارت کے گل محمد کو اس وقت دنیا کے سب سے پست قامت انسان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ گل محمد ۱۵ فروری ۱۹۵۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کا قد ساڑھے بائیس انچ ہے۔

وہ پیچھے نہیں ہٹا

ع۔ ع۔ طاہر

باٹا پور کے پل پر زبردست جنگ جاری تھی۔ دشمن ڈوگری گاؤں کے محفوظ مورچوں میں تھا۔ اے کمپنی کو بی آر بی کے اگلے مورچے چھوڑ کر پیچھے آنے کا حکم دیا گیا کیونکہ پل کو اڑانا تھا تاکہ دشمن پل سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پلاٹونیں پیچھے آگئیں لیکن ایک نوجوان سپاہی محمد حیات جو نیا نیا ٹریننگ سنٹر سے بٹالین میں شامل ہوا تھا، مورچے میں ہی رہا۔ اس کے ساتھی کے بیان کے مطابق اس کے پاس چالیس گولیاں رہ گئی تھیں۔ پیچھے آنے کا حکم ملا تو اس نے غصے سے کہا۔ "اگر پیچھے ہٹانا تھا تو مجھے ایمونیشن کیوں دیا تھا۔ میں یہ گولیاں فائر کرکے پیچھے آؤں گا....." وہ آج تک پیچھے نہیں آیا، نہ اس کی لاش مل سکی تھی..... سپاہی محمد حیات کے متعلق فائر بندی کے بعد بھارتی فوجیوں نے بتایا کہ جب اے کمپنی مورچہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی تو ہم آگے بڑھنے لگے تو ایک ہی رائفل ایسی تھی جس سے فائرنگ ہوتی رہی۔ اس رائفل کی کوئی گولی خطا نہیں جاتی تھی۔ آخر یہ رائفل خاموش ہو گئی۔ بھارتی فوجیوں کے بیان کے مطابق اس مورچے کو گھیرے میں لے لیا گیا جہاں صرف ایک پاکستانی نوجوان خالی رائفل تھامے کھڑا تھا۔ یہ سپاہی محمد حیات تھا جو چالیس گولیاں فائر کرکے چالیس سورمے گرا چکا تھا۔ دشمن نے اسے ہتھیار ڈالنے کے لئے للکارا لیکن وہ دست بدست مقابلے پر اتر آیا۔ دشمن نے اس پر قابو پا لیا۔ ایک بھارتی افسر نے اعتراف کیا کہ اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر سنگینوں سے مارا گیا تھا۔

وہ ٹھیک کہتا تھا

منیر احمد راشد

لڑائی سے مجھے بچپن ہی سے چڑ تھی۔ اور جب فیروز خان سے میری دوستی ہوئی تو یہ چڑ، نفرت میں بدل گئی۔ فیروز خان باکسر تھا اور عمر میں مجھ سے تقریباً آٹھ دس سال بڑا، لیکن میرا خیال ہے دوستی کے لئے ہم عمری سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی ضروری ہوتی ہے یہی وجہ تھی کہ ہمارے عمروں کا اتنا زیادہ فرق ہماری دوستی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ میرا اور اس کا اکثر ساتھ رہتا تھا اس لئے اس کی باکسنگ کا مظاہرہ دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے لڑائی سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ فیروز خان جب بھی لڑتا تھا، اپنے ہنر کا بے پناہ استعمال کرتا اور سامنے والے کو منٹوں میں ڈھیر کر دیتا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ کہ اکثر وہ حق بجانب ہوتا تھا لیکن پھر بھی میں کہتا تھا کہ انسان لڑے ہی کیوں..... پیار محبت، برداشت تحمل، ایثار و قربانی سے اس دنیا کو جنت کیوں نہ

بنائے.........فیروز خان سے اکثر اس موضوع پر بحث بھی ہوجاتی تھی جو کبھی بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اگر انسان خود لڑنا نہ چاہئے تو اس پر لڑائی مسلط نہیں کی جاسکتی.........اور اگر کوئی بد فطرت ایسا کرنے کی کوشش کرے تو انسان اسے اپنے تحمل اور برداشت سے اس حرکت سے باز رکھ سکتا ہے۔ ہماری زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ جب فریق ثانی لڑائی پر آمادہ تھا مگر میرے نرم لہجے اور ضبط کی وجہ سے لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ میں اسے بزدلی نہیں سمجھتا تھا۔ جبکہ فیروز خان کا خیال میرے برعکس تھا۔

اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بنیادی طور پر وہ بھی ایک امن پسند اور صلح جو شخص ہے لیکن اسے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے اور میرے خیال میں غصہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے مقابل کو منٹوں میں چت کر سکتا ہے یعنی اپنی طاقت اور قوت کا غرور اور اپنے فن کے ماہرانہ استعمال کا احساس ہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر وہ اکثر لڑتا رہتا تھا۔ بلکہ ایک بار جنگ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کیا تم امریکہ ہو اور اپنی باکسنگ کو اپنا ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سمجھتے ہو کہ دوسرے تم سے ڈرتے رہیں؟ میرے اس جملے پر وہ تھوڑا ناراض ہوا.........اور ذرا تلخی سے جواب دیا، "میں امریکہ نہیں ہوں پاکستان ہوں۔ جس طرح عزت اور وقار سے جینے کے لئے پاکستان کی ایٹم بم کی ضرورت ہے اسی طرح مجھے باکسنگ کی ضرورت ہے..." مزید تلخی کے خوف سے میں نے بات وہیں ختم کردی تھی۔

فیروز خان کی شدید خواہش تھی کہ میں بھی باکسنگ سیکھوں کیونکہ میرا لمبا قد اور مضبوط جسم اس کھیل کے لئے بہت موزوں تھا۔ مگر میں فطری طور پر ایسے وحشیانہ کھیلوں سے دور ہی رہتا تھا۔ البتہ ہاکی اور اتھلیٹکس میرے پسندیدہ کھیل تھے کہ یہ کسی دوسرے کے لئے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتے تھے۔ فیروز خان کی ضد جاری رہی مگر میں بھی اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور دن گزرتے رہے۔

اس مرتبہ میٹھی عید پر گھر جاتے ہوئے فیروز خان نے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ ریزرویشن نہیں ہو سکی تھی مگر اپنی ضدی طبیعت کی وجہ سے فیروز خان نے ہر صورت میں سفر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ عید سے دو روز پہلے ہم اللہ کا نام لے کر اسٹیشن پر پہنچے اور جس ڈبے میں بھی پاؤں رکھنے کی جگہ ملی، زبردستی گھس گئے۔ اب عالم یہ تھا کہ سواریاں ایک دوسرے کے اوپر نیچے ٹھنسی ہوئی تھیں۔ خواتین و حضرات کا کوئی امتیاز باقی نہیں تھا۔ لوگوں کے ساتھ جو سامان تھا وہ بھی سیٹوں کے نیچے اوپر، فرش پر اور کہیں کہیں تو لوگوں کے سروں پر رکھا تھا۔ میں اور فیروز خان گیٹ کے بالکل برابر والی سنگل سیٹ کے قریب جگہ حاصل کر پائے تھے۔ اس سیٹ پر ایک خان صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کا خاصا سامان بھی ان کے ہمراہ تھا۔ دو بڑی بڑی بوریاں شاید برتنوں سے بھری ہوئی تھیں

قدیم ترین رسالہ

○...... دنیا کا سب سے قدیم جریدہ (رسالہ) جو مسلسل طباعت کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ "فیلو سوفیکل ٹرانزیکشن آف دی رائل سوسائٹی" ہے۔ یہ رسالہ لندن سے شائع ہوتا ہے۔ اور پہلی بار ۶ مارچ ۱۶۶۵ء کو چھاپا تھا۔

○...... کرٹس کا "بوٹا میگزین" ۱۷۸۷ء سے مسلسل چھپ رہا ہے۔

○...... برطانیہ کا سب سے قدیم ہفت روزہ "دی لانیسٹ" ہے جو ۱۸۲۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اسکاٹس میگزین جنوری ۱۷۳۵ میں چھپنا شروع ہوا تھا ۱۸۲۶ء تک مسلسل باقاعدگی سے چھپتا رہا۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء سے شائع ہو رہا ہے جس میں صرف دو تین بار وقفے آئے ہیں۔

مرسلہ: علی جہان ملک، مخدوم پور

سیٹ کے نیچے ایک پھولا ہوا بیگ دھنسا تھا۔ اس کے برابر دیسی گھی کا ایک کنستر، جو سیٹ سے باہر نکلا ہوا اور دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ خود خان صاحب نے بھی سیٹ کے علاوہ اچھی خاصی جگہ گھیری ہوئی تھی اور دور دور تک پاؤں پھیلا دیئے تھے۔ خوب صحت مند جسم کے مالک تھے۔ چہرہ کرخت، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور سرخ، گھنی مونچھیں، سر پر بہت بڑی سی پگڑی۔ فراک نما لمبی سی قمیص اور ہزاروں بل والی گھیر دار شلوار پہنے موصوف سیٹ کو چارپائی سمجھ کر بیٹھے تھے۔ مسلسل چوکنی نظروں سے ایک ایک مسافر کو تکتے پھر اپنا سامان بھی دیکھتے کہ کہیں کوئی اسے ہلا جلا کر خراب کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ ذرا کسی کا پاؤں بوری یا کنستر سے لگا۔ خان صاحب خود فوراً اس پر چڑھ دوڑے۔

"خو خانہ خراب اُلو .... برتن ٹوٹے گی۔"

میں چونکہ خان صاحب کا قریب ترین پڑوسی تھا اس لئے اس بات کا زیادہ احتمال تھا کہ ان کی جائداد پر دست درازی کر بیٹھوں .... وہ مسلسل مجھے گھور رہے تھے اور میں بہت ہمت کر کے ابھی تک خود کو کنستر سے دور رکھے ہوئے تھا۔ اسی عالم میں حیدر آباد آ گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اب میرے لئے کھڑا رہنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ حسب دستور ذرا ذرا سا کھسک کر میں تھوڑی دیر کے بعد فرش پر ٹکنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن یہ بیٹھنا ہی دراصل میرے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ کیونکہ بیٹھنے کے بعد نا چاہتے ہوئے بھی کنستر کا سہارا لینا مجبوری تھی جونہی کنستر سے میرا گھٹنا ٹچ ہوا خان صاحب گرجے

"خو خانہ خراب اُلو .... کنستر ٹوٹے گی۔"

"نہیں ٹوٹے گی بھائی .... یہ پلاسٹک کی تھیلی تھوڑا ہی ہے۔" میں نے گھٹنا کنستر سے الگ رکھنے کی ناکام کوشش کی کیونکہ ایک دوسرے میں پھنس کر بیٹھی ہوئی سواریوں کے وزن کے نیچے دبا ہوا میں بے چارا خود کو بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھا۔

"ہاں ٹوٹے گی۔ یہ پلاسٹک ہے۔ تم یہ غرق کرو۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں بولتے اور

بڑی بد تمیزی اور بے دردی سے میرے گھٹنے کو کنستر سے دور دھکیلتے ہوئے کیا۔ مگر گھٹنا فوراہی کسی اسپرنگ کی طرح واپس کنستر سے آلگا۔ خان صاحب کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ گھور کر مجھے دیکھا۔ اور کاٹ کھانے والے لہجے میں بولے،

"ہٹو! نہیں تو تمہارا ٹانگ توڑے گی۔"

"بھئی کیسے ہٹوں آپ دیکھتے نہیں کتنا رش ہے۔"

ہاں نہیں دیکھتے۔"

"بھائی سفر میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ ذرا دیر کا سفر ہے تھوڑی تکلیف برداشت کرو۔"

"تکلیف مکلیف ہم نہیں جانتا، تم ہٹو۔"

(ایک اور دھکا)

"جناب آپ دیکھیں....."

"ہم نہیں دیکھتا۔"

"بھئی بات تو....."

"ہم کچھ نہیں جانتا..... تم ہٹو۔" (اڑیل ٹٹو)

"جناب میں کہاں جاؤں"

"جہنم میں جاؤ..... پر ادھر سے ہٹو۔" اس نے تقریباً ٹھوکر مارنے کے انداز میں مجھے پاؤں سے دھکا دیا۔ بہت غصہ آیا..... مگر میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اے دیکھو ذرا تمیز سے بات کرو۔"

"تمیز کیا ہوتا ہے..... تم ہم کو تمیز سکھائے گا تم ہمارا باپ ہے.....؟"

میرے ضبط کے بندھن ذرا ڈھیلے ہوتے جارہے تھے۔ گہری سانس لیتے ہوئے میں نے کہا،

"لو یار تم خوش رہو، میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔" اور بمشکل اٹھ کر کھڑا ہو گیا

"یار..... تم نے ہم کو یار بولا!؟ کیا ہم بازاری ہے؟"

"ارے اب کیا تکلیف ہے اب تو میں کھڑا ہوں" تکلیف بولتا ہے..... یار بولتا ہے۔ ہم تم کو نہیں چھوڑے گا خانہ خراب۔" انہوں نے با باقاعدہ آستینیں چڑھانا شروع کر دیں..... میں نے بات ختم کرنے کے لئے سلام کرنے کے سے انداز میں ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"جاؤ یار بس کروں..... میں جھگڑا نہیں کرنا چاہتا"

"اوئے تم کر ہی نہیں سکتا۔ شتر مرغ کا بچہ۔ ہم تم کو ٹھڈا مارے گا فٹ بال بنائے گا۔" اس کی بکواس جاری تھی اور میرا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں مکا مار کے اس کے دانت توڑ دوں ..... لیکن اندر کہیں ایک بے نام سا خوف موجود تھا کہ میرے مکے سے تو شاید اس کے دانت کو کوئی زحمت نہ ہو لیکن اگر اس نے ایک جھانپڑ رکھ دیا تو میں ضرور بے بتیسی کا ہو جاؤں گا۔ غصہ کی زیادتی اور اپنی بے بسی کے احساس سے میری زبان گنگ ہو گی تھی اور میں دانت بھینچے غضب ناک نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"دیکھتا کیسا ہے الو کا جیسا..... تمہارا بلب فیوز

افریقہ کے جنگلوں میں!

۱۔ "گریہ" نامی ایسا درخت ہے جس کے نیچے آگ جلانے سے وہ رونے لگتا ہے اور اس کے پتوں و شاخوں سے پھوار برسنے لگتی ہے۔

۲۔ "لوہبرا" نامی ایسا درخت ہے جس کی شاخیں کاٹنے پر خون بہنے لگتا ہے۔

۳۔ "کرد" درخت کی شاخیں لوہے سے زیادہ سخت ہوتی ہیں۔

۴۔ دریا کی مچھلیوں کی بعض اقسام اڑتی ہیں اور درختوں پر گھونسلے بنا کر رہتی ہیں۔

۵۔ ایک ایسا بھی درخت ہے جس کی شاخیں پکانے پر مچھلی کے گوشت کا سا ذائقہ آتا ہے۔ ان کو کھانے والا بوڑھا بھی جوان ہو جاتا ہے۔

۶۔ صحرا کے درختوں میں سے رات کو سات رنگ کی روشنیاں نکلتی ہیں۔

(صادق حسین صدیقی کے ناول "فتح افریقہ" سے اقتباس)

مرسلہ محمد عبدالستار خان، بونیال۔

کرے گی۔" اس نے میری آنکھوں میں پنجے گھیڑنے کی کوشش کی۔ میں نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا پھر بھی اس نے میری گردن دبوچ کر جھنجوڑنی شروع کر دی۔ وہ شاید یہ مشق کچھ دیر اور جاری رکھتا مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے کان کے پاس سے کوئی شے "زن" کی آواز سے گزری اور دھپ سے کسی شے سے ٹکرائی فوراً میری گردن آزاد ہو گئی۔ اور یہ بھید کھلا کہ وہ زناٹے دار چیز فیروز خان کا آہنی گھونسہ تھا جس نے خان صاحب کے دروازے پر دستک دی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گھونسوں کی مزید دو چار پروازیں اور کلیشنر ہوئے اور خان صاحب سیٹ پر لینڈ کر گئے۔ لوگ جو خاصی دیر سے تماشا دیکھ رہے تھے فوراً بیچ بچاؤ کرانے کے لئے آئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہماری کوششیں کامیاب ہوئیں اور کچھ لوگ فیروز خان کو اور کچھ خان صاحب کو پکڑے لڑائی سے باز رکھنے میں مصروف ہو گئے۔ لڑائی تقریباً ختم ہو گئی۔ البتہ حسب روایت تھوڑی دیر تک دونوں جانب سے غیر پارلیمانی زبان میں ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دینے کے دعوے جاری رہے۔ پھر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں اب پھیل کر بیٹھا تھا اور میری پشت کا سہارا وہ بے چارہ کنستر بنا ہوا تھا۔ خان صاحب نے البتہ پاؤں سمیٹ کر سیٹ کے اوپر کر لئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میری اور فیروز خان کی نظریں چار ہوئیں تو میں نے ان میں ایک شوخ طنزیہ مسکراہٹ دیکھی۔ اس مسکراہٹ کے پس منظر میں لکھی تحریر مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا ہزار بار کا دہرایا ہوا جملہ...

"پرامن رہنے کے لئے صرف امن پسند ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ آپ کو اتنا طاقت ور ہونا چاہئے کہ آپ پر جنگ مسلط نہ کی جا سکے۔"

میں نے فیصلہ کیا کہ لیہ سے واپسی پر میں بھی باکسنگ سیکھنا شروع کروں گا۔

شہر کے چوک کی بتیاں

شہر کے چوک میں بتیاں ہیں لگی ایک جلتی ہوئی ایک بجھتی ہوئی
زرد بتی کا مطلب ہے بس اب رکو سرخ کہتی ہے ہرگز نہ آگے بڑھو
سبز کہتی ہے ہاں اب نہ بالکل ڈرو راستہ صاف ہے بے دھڑک چل پڑو

○ ○

بتیوں کے اشارے پہ جو بھی چلا حادثوں سے ہمیشہ رہا وہ بچ
اور جس نے نہیں ان کی پرواہ کی اس کی ٹکر ہوئی اور چالان بھی
ٹوٹی گاڑی بھی اور خود بھی زخمی ہوا جان بچ بھی گئی تو اپاہج بنو
جان اور مال دونوں کا نقصان ہے بس عزیزو اسی طرح قرآن ہے

○ ○

اس میں بھی دو ہی قسموں کے احکام ہیں اور وہ احکام انسان کے نام ہیں
جھوٹ، غیبت، حسد، چوری، دھوکہ دہی اپنے دل میں ہے ایک سرخ بتی لگی
جو ہمیں ایسے کاموں سے ہے روکتی ہر برائی پہ ہے یہ ہمیں ٹوکتی
سرخ بتی جہنم کی پہچان ہے اس طرف آگے بڑھنے میں نقصان ہے
جو بھی بدبخت اس سمت کو جائے گا آخر اپنے کئے کی سزا پائے گا
ہوگی دنیا میں بھی جگ ہنسائی بہت آخرت میں بھی ہوگی پٹائی بہت

○ ○

سبز بتی بھی قرآں میں ہے دوستو! وہ نظر آئے تو بے خطر چل پڑو
نیکی، سچائی، ہمدردی، پاکیزگی ایسے کاموں پر ہے سبز بتی لگی
یعنی یہ کام سارے کئے جاؤ تم اور صلہ اپنے رب سے لئے جاؤ تم
زندگی عافیت سے گزر جائے گی ساتھ ہی عاقبت بھی سنور جائے گی

گُلگُلے

انعامی لطیفہ

○ ..... "کراچی میں مقتدرہ قومی زبان کا اجلاس ہو رہا تھا۔
گورننگ باڈی کے ممبر پروفیسر پری شان خٹک کو بھی اسلام آباد سے اس نشست میں شرکت کے لئے آنا تھا۔ انہیں لینے کے لئے مقتدرہ کی طرف سے ہوائی اڈے پر ایک گاڑی بھیجی گئی جس کا ڈرائیور ایک ان پڑھ پٹھان تھا۔ وہ پری شان خٹک کے نام کی تختی اٹھائے بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ فلائٹ میں دیر تھی۔ وہ کافی بدحواس ہو چکا تھا۔ اتنے میں فلائٹ آگئی۔ پری شان خٹک اترے اور اپنے نام کا بورڈ پڑھ کر اس کے پاس پہنچے اور کہا، "میں پری شان ہوں۔"
ڈرائیور نے غصے سے جواب دیا۔ "او خوچہ جاؤ ہم خود بہت پریشان ہے۔"

(مرسلہ..... حسیب احمد خان)

○ ..... امریکہ میں ایک ہوٹل صرف گوروں کے لئے مخصوص تھا۔ ایک دن وہاں ایک کالا چلا گیا اور ایک مشروب کا آرڈر دیا۔ بیرا منیجر کے پاس گیا اور کہا کہ "یہ کالا ہوٹل میں آگیا ہے یہاں کالوں کا داخلہ منع ہے۔ کیا میں اسے بھگا دوں؟"
"ایسا کرو!" منیجر نے سوچتے ہوئے کہا "تم اسے مشروب دے دو لیکن بل پورے بیس ڈالر کا وصول کرو۔" بیرے نے ہدایت پر عمل کیا۔
کالے نے دو گلاس مشروب پی لیا۔ بل پوچھا تو اسے چالیس ڈالر بتایا گیا۔ کالے نے تیسرے گلاس کا آرڈر دیا اور تیسرا گلاس پی کر جب جانے لگا تو منیجر کے کہنے کے مطابق اس سے سو ڈالر کا بل وصول کیا گیا جو کالے نے بخوشی ادا کر دیا۔
جب کالا ہوٹل سے باہر چلا گیا تو منیجر نے بیرے کو بلا کر کہا..... "گورے کنگلوں کی ایسی کی تیسی، باہر

بورڈ لگا دو کہ یہ ہوٹل صرف کالوں کے لئے ہے۔"

مرسلہ..... راشد، اشرف اعوان، حیدرآباد)

○.....○.....○.....○

..... ایک شخص کے گھر چوری ہوگئی۔ چور گھر کا تمام سامان جس میں عید کے کپڑے اور جوتے وغیرہ شامل تھے چوری کر کے لے گئے۔ گھر کے تمام لوگ صحن کے بیچوں بیچ سر پکڑ کر پریشان بیٹھے تھے کہ عید کس طرح منائیں گے اچانک دروازے پر دستک ہوئی، بچے نے جاکر دروازہ کھولا اور ڈاکیا کے ہاتھ سے ایک لفافہ لے کر گھر والوں کے ہاتھ میں پکڑا دیا جس پر لکھا تھا "خدا آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے"

(مرسلہ..... گوگا۔ بلدیہ ٹاؤن)

○.....○.....○.....○

○ ..... ایک آدمی ایک بڑے جنرل اسٹور میں داخل ہوا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ دکان کے مالک نے جلدی سے اٹھ کر اسے پانی پلایا۔ اس آدمی کے جب اوسان بحال ہوئے تو دکاندار نے پوچھا "فرمائیے! آپ کچھ کہنا چاہتے تھے؟" اس شخص نے دکاندار کے ہاتھ میں بیگ پکڑایا اور جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے بولا "یہی کہ تمام رقم نکال کر اس بیگ میں ڈال دو۔"

(فیصل احمد شجراہ کندھ کوٹ)

○.....○.....○.....○

○ ..... اسکول میں وزیرِ تعلیم آنے والے تھے۔ سارا عملہ فکر مند تھا۔ استادوں نے بچوں کو سوالات کی مشق کرادی تھی۔ مثلاً ایک لڑکے کو صرف اس بات کی مشق کرائی گئی کہ جب وزیرِ تعلیم تم سے پوچھیں کہ تمہیں کس نے بنایا ہے تو جواب دینا کہ ہمیں خدا نے بنایا ہے۔

وقت مقررہ پر وزیرِ تعلیم آئے۔ انہوں نے کلاس سے سوال کیا "بھئی آپ لوگوں کو کس نے بنایا ہے؟" پوری کلاس پر خاموشی چھائی رہی۔ وزیرِ تعلیم نے یہی سوال جب دوبارہ پوچھا تو ایک چھوٹی سی بچی نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہا "سر جس لڑکے کو خدا نے بنایا تھا، وہ آج اسکول نہیں آیا، اسے بخار ہے۔"

(جنید روف۔ بلدیہ ٹاؤن)

○.....○.....○.....○

○..... ایک پاکستانی بچہ اپنے ابو کے ساتھ روس گیا۔ وہاں انہوں نے لینن کا ایک ایسا مجسمہ دیکھا جس کی قمیص غائب تھی اور وہ صرف نیکر پہنے کھڑا تھا۔ مجسمے کے چہرے پر غور و فکر اور سوچ کے تاثرات تھے۔ قریب ہی ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا "مفکر۔"

ابو نے بچے کی ذہانت کا امتحان لینے کی غرض سے پوچھا "بیٹے! کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ مجسمے والا آدمی کیا سوچ رہا ہے؟"

"بڑی آسان سی بات ہے۔" بچے نے کچھ دیر غور کیا پھر اپنے ابو سے کہا۔ "یہ سوچ رہا ہے کہ میں نے اپنے کپڑے کہاں رکھے ہیں؟"

(مرسلہ:۔ زاہد منان قریشی، آزاد کشمیر)

○.....○.....○.....○.....

○..... بچوں کو سستی پر مضمون لکھنے کو دیا گیا۔ دوسرے دن کاپیاں چیک کرتے وقت استاد کے پاس ایک کاپی ایسی بھی آئی جس میں پہلی سطر سے آخری سطر تک صفحہ خالی تھا، البتہ سب سے نیچے درج تھا۔

"جناب یہ ہے سستی!"

(مرسلہ..... شاہدہ مناف، نیو کراچی)

○.....○.....○.....○.....

○..... ایک شخص جس کی آواز بہت بھونڈی تھی، اسے موسیقی کا بے حد شوق تھا۔ ہر وقت وہ اپنے گھر میں بے سری آواز میں ساز بجا کر گانے گایا کرتا۔ اس کی بے سری آواز اور بے ہنگم موسیقی سے سارا محلہ پریشان تھا۔ ایک دن اس نے اپنے پڑوسی سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ موسیقی سے پانی کھول سکتا ہے؟"

"پانی تو نہیں، البتہ خون ضرور کھولنے لگتا ہے۔" پڑوسی نے غصے سے جواب دیا۔

(مرسلہ..... فرحان لانڈھی، کراچی)

○.....○.....○.....○.....

○..... ایک شخص کافی دیر سے دکان کو گھورے جا رہا تھا دکاندار سے نہ رہا گیا اس نے پوچھ ہی لیا۔

"بھائی جان! آخر آپ کو کیا چاہئے؟"

اس شخص نے جواب دیا "صرف موقع۔"

(مرسلہ..... محمد اسلم۔ یونیورسٹی روڈ کراچی)

○.....○.....○.....○.....

○..... استاد..... (شاگرد سے) "بتائیے آپ کو کون سا جانور زیادہ پسند ہے؟"

شاگرد..... "سر! مجھے بلی بہت پسند ہے۔"

استاد..... "وہ کیوں؟"

شاگرد..... "جناب! وہ اس لئے کہ میں الماری

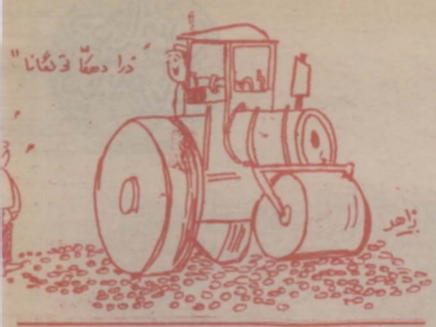

سے دودھ نکال کر پی لیتا ہوں اور اس کا الزام بلی پر لگ جاتا ہے۔"

(مرسلہ..... قیصر محمود، سیالکوٹ)

○.....○.....○.....○.....○

○..... ایک پڑوسن (دوسری پڑوسن سے) "ابے بہن تمہارا چھوٹا بیٹا ہر وقت انگوٹھا چوستا رہتا تھا۔ بڑی بُری عادت تھی پر سنا ہے کہ اس کی یہ عادت چھوٹ گئی ہے۔ کس طرح چھڑائی تم نے اس کی یہ عادت؟"

دوسری پڑوسن "میں نے اس کی نیکر کا لاسٹک نکال کر اس کی جگہ ایک بہت ڈھیلا لاسٹک ڈال دیا ہے اب وہ ہر وقت اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی نیکر کا لاسٹک پکڑے رہتا ہے۔"

(مرسلہ..... یاسر علی ساہیوال)

○.....○.....○.....○

○..... ایک بچہ کسی سے سفید کتا لے آیا۔ اسے وہ کتا بہت پسند تھا لیکن گھر والے کتے سے سخت پریشان تھے۔ ایک دن گھر والوں نے بچے سے کہا "اگر تم کتے سے جان چھڑالو تو ہم تمہیں سو روپے دیں گے۔" بچے نے دوسرے دن ہی کتے سے جان چھڑالی۔ گھر والے بہت خوش ہوئے۔ بچے کی امی نے سو کا نوٹ دیتے ہوئے اس سے پوچھا.....

"بیٹا! آپ نے کتے سے نجات کس طرح حاصل کی؟" بچے نے مسکراتے ہوئے سو کا نوٹ جیب میں رکھا اور بولا.....

"میں کتا تو فرید کو دے آیا ہوں اور اس کے بدلے دو پلے لے آیا ہوں"

(مرسلہ..... محمد عامر ایاز لطیف آباد)

اپنے مٹاپے سے بیزار ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے پچاس گولیوں سے بھری ایک شیشی اسے پکڑا دی۔

"ڈاکٹر صاحب"..... مریض نے پر امید ہو کر کہا۔ "کیا یہ سب گولیاں کھانے سے میرے مٹاپے میں خاطر خواہ کمی ہو جائے گی؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "یہ گولیاں کھانے کے لئے نہیں ہیں۔ آپ ہر روز صبح سویرے بستر سے اٹھنے کے بعد اس شیشی کی تمام گولیاں فرش پر الٹ دیں۔ اور شیشی اپنے قد کے برابر کسی اونچی جگہ پر رکھ دیں۔ اس کے بعد باری باری ایک گولی فرش سے اٹھائیں اور شیشی میں ڈالتے جائیں۔ چند روز تک یہ علاج باقاعدگی سے کریں انشاء اللہ افاقہ ہو گا۔"

مرسلہ۔ عمران شفیع کراچی

واقعات عالم سے
واقف کرانے کے
لئے آنکھ مچولی کا
نیا سلسلہ مضامین

بوسنیا کے مسلمانوں کا خون کب تک بہتا رہے گا

سہیل احمد صدیقی

ٹی وی کے خبرنامہ سے اخبارات تک ایک نام تقریباً ہر روز ہر وقت ہمارے کانوں سے ٹکراتا ہے اور ہمیں خون کے آنسو رلاتا ہے..... بوسنیا ہرزے گووینا..... کچھ عرصہ قبل ہم میں سے اکثر اس نام سے ناواقف تھے، آج سب جان گئے ہیں کہ بوسنیا ہرزے گووینا، یوگوسلاویا سے آزاد ہونے والی اسلامی ریاست ہے، جس نے یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو اپنی آزادی کا اعلان کیا۔

عزیز ساتھیو! آپ یقیناً یہ جاننے کے خواہش مند ہوں گے کہ بوسنیا ہرزے گووینا کا مسئلہ کیا ہے، وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیوں ہو رہا ہے اور ان کی امداد کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے؟

بوسنیا ہرزے گوونیا اصل میں دو ریاستوں بوسنیا اور ہرزے گوونیا کے اتحاد سے وجود میں آیا۔ اس کے شمال مغرب میں جمہوریہ سربیا اور مشرق میں جبل اسود اور یوگو سلاویہ ہیں۔ اس کا رقبہ تقریباً ۶۰ ہزار کلو میٹر ہے۔ یہ حسین ملک پہاڑوں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں موسم معتدل رہتا ہے۔ بارشیں کافی ہوتی ہیں۔ اس کا دارلحکومت سیراجیو ہے۔

تاریخی لحاظ سے بوسنیا ہرزے گوونیا ۲۶/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو یوگو سلاویہ میں شامل ہوا تھا۔ اس سال کے شروع میں جب روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تو بوسنیا ہرزے گوونیا کے مسلمانوں نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ گویا ۷۳ سال بعد یہاں کے مسلمانوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔

لیکن یہ آزادی بوسنیا ہرزے گوونیا کے مسلمانوں کو بہت مہنگی پڑی۔ اور یوگو سلاویہ کی فوجوں کی مدد سے پڑوسی ملک سربیا نے مسلمانوں کی اس آزاد مملکت کو ختم کرنا شروع کر دیا ہے۔ سربیا نے اس کے ایئرپورٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے کسی قسم کے امدادی سامان کو شہر میں لے جانے کی اجازت نہیں ہے اور وہاں کے مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سربیا نے بوسنیا ہرزے گوونیا کی آزادی کو تسلیم نہیں کیا ہے اور بوسنیا ہرزے گوونیا میں بسنے والے سرب باشندوں کو بغاوت پر اکسایا اور ان کی تخریبی کارروائیوں کی بھرپور طریقے سے پشت پناہی کی اور انہیں مسلح امداد بھی دی۔ پھر خانہ جنگی کی آگ کو بھڑکانے کے لئے اپنی فوجیں بوسنیا ہرزے گوونیا میں داخل کر دیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جس کے سبب سربیا نے جارحیت شروع کی؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس ملک میں شروع سے تین قومیں آباد ہیں ان کے نام سرب، کروٹ اور سلاف ہیں، سرب ابتداہی سے ظلم و جبر کی مدد سے دوسری قوموں پر حکومت کے شوقین رہے ہیں۔ سرب قوم عیسائی ہے۔ (آج کل یہ کُل آبادی کا ۳۱ فی صد ہیں)، جب کہ کروٹ (کل آبادی کا ۱۷ فی صد) ۔ فرق یہ ہے کہ سرب قوم عیسائی فرقہ آرتھو ڈوکس (یونانی گرجا) سے تعلق رکھتی ہے۔ اور کروٹ رومن کیتھولک ہیں۔

ان دونوں قوموں میں صدیوں سے مذہب اور نسل کی بنیاد پر جنگ ہوتی آئی ہے۔ ترک عثمانی سلطنت کے دور میں جب بوسنیا کے باشندے ان دو عیسائی فرقوں کے آئے دن کے تصادم اور ان کے مظالم سے تنگ آگئے تو انہیں اسلام کے دامن میں پناہ ملی۔ سلطان مراد اول نے اس علاقے کو عثمانی سلطنت میں شامل کیا تو ترکوں کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر یہاں کے بے شمار لوگ مسلمان ہو گئے۔ آج وہی مسلمان، سرب قوم کی جارحیت کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہاں کے

دنیا میں..... کہاں..... کیا

- دنیا میں سب سے زیادہ مساجد ترکی میں ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ ریلیں امریکہ میں چلتی ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ جھونپڑیاں بھارت میں ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ کرومائٹ پاکستان میں ملتی ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ موٹر سائیکلیں جاپان میں ہوتی ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ آبشاریں ندوے میں ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ گوند سوڈان میں پائی جاتی ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ جھیلیں اور دریا روس میں ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ فلمیں جاپان میں بنتی ہیں۔
- دنیا میں سب سے زیادہ زمین دوز ریلوے اسٹیشن امریکہ میں ہیں۔

(مرسلہ..... قیصر محمود قیاسی..... مانسہرہ)

ہزاروں مسلمان ہجرت کر کے کروشیا کے علاقے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بے شمار بچے غذا نہ ملنے کی وجہ سے بھوک سے مر گئے ہیں۔ سربیا کی فوج مسلمانوں کے قتل عام کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتی ہے کیونکہ اسکولوں اور چرچوں میں انہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہمیں مسلمانوں سے خلافت عثمانیہ کا بدلہ لینا ہے۔ قدامت پسند پادریوں کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان پر شراب ڈال کر قتل کریں تو خدا راضی ہو گا اور زمین پاک ہو جائے گی سربیا کے ظلم و ستم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے تین ماہ میں چالیس ہزار سے زائد مسلمان قتل کئے جا چکے ہیں۔ چالیس ہزار سے زائد زخمی ہیں، اپاہج ہونے والوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے۔ ۱۵ لاکھ مسلمان یہاں سے ہجرت کر چکے ہیں اور ایک لاکھ لاپتا ہیں جن کو سربیا کی فوج پکڑ کر لے گئی ہے، یا جیلوں میں بند ہیں۔

بوسنیا ہرزے گووینا کے مسلمان صدر عزت علی جاہ بیگ، مسلمان وزیر خارجہ حارث سلاجق (جو ۸ اگست کو پاکستان کے دورے پر بھی آئے)، وزیر اعظم ژور پیلی وان، اور اقوام متحدہ کی امن کے قیام کی تمام کوششیں اب تک ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ امریکی صدر بش نے طاقت کے استعمال کی محض دھمکی دی ہے اور اسلامی ممالک کی نمائندہ تنظیمیں بھی سرب فوج کے ظلم و ستم کے خلاف زبانی جمع خرچ کر رہی ہیں۔ بوسنیا ہرزے گووینا کے مسلمان قتل ہو رہے ہیں اور ان کی مسجدیں تباہ ہو رہی ہیں اور دنیا خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ آیئے ساتھیو! خدا سے دعا مانگیں کہ وہ ہمارے ان کمزور اور مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد فرمائے اور مسلمانوں کو اس ظلم کے خلاف متحد ہونے کی توفیق دے۔ (آمین)۔

محمد عمران سعید

اورنگ زیب ۔ آزاد کشمیر

اے نگارِ وطن تو سلامت رہے

محمد عمران سعید ۔ کراچی

دستانوں کے جوڑے بنائیے

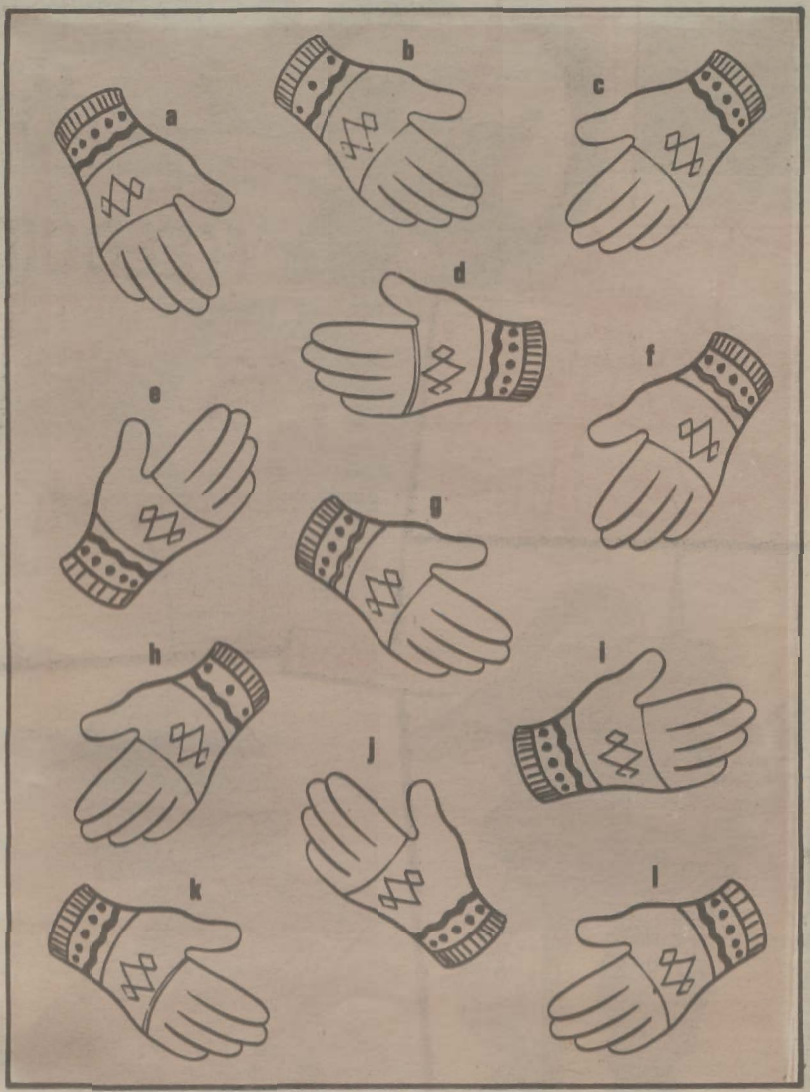

لذّت کی دُنیا میں ایک مُعتبر نام
احمد
©
احمد کے جام جیلی، ٹماٹو کیچپ اور پکے پکائے کھانے اپنے منتخب اجزاء، اعلیٰ معیار
اور بے مثل ذائقے کے سبب مُلک اور بیرونِ مُلک بیحد پسند کیے جاتے ہیں۔
لذیذ اور معیاری اشیاء کے لیے ہمیشہ احمد کی مصنوعات کا انتخاب کیجیے جنھیں
برسوں سے صارفین کا اعتماد حاصل ہے۔
احمد کا نِشان — معیار کی پہچان
APPLE PRESERVE
(APPLE IN SYRUP)
PINEAPPLE
JELLY
RASPBERRY
JAM
پایا
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

بچوّں کیلئے انمول تحفہ

ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے، خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت کچھ

فن کار : ظِل سبحان، نگہت بٹ، قاسم حبیبی، جمشید انصاری، لطیف منا، نجیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی : ارشد محمود ، پروڈیوسر: ظفر محمود شیخ ، ھدایات : سلیم مغل، اظہر نیاز !

ویڈیو میگزین
آنکھ مچولی

آج ہی طلب فرمائیے

قیمت: 150 روپے

Aankh Macholi Video Magazine
1 - PIB Colony Karachi

بہ خدمت جناب

قیصر محمود عباسی، مانسہرہ...... "کشمیر نمبر" پر پہلا انعام حاصل کرنے پر مبارک باد قبول کریں۔

عابد گل، ہری پور...... میں پہلے ایک اور رسالہ پڑھتا تھا۔ پچھلے دنوں میں آنکھ مچولی لایا تو گھر والوں کو اتنا پسند آیا کہ اب میں نے یہ رسالہ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

گل بانو حیدر آباد...... میں چار سال سے آنکھ مچولی پڑھ رہی ہوں۔ کوئی کہانی ترجمہ کر کے بھیجوں تو آپ شائع کر دیں گے؟

○...... کیوں نہیں۔ بشرطیکہ کہانی اچھی ہوئی۔

ارم رؤف، راولپنڈی...... مجھے آنکھ مچولی کا بہت انتظار رہتا ہے۔ جس دن رسالہ آتا ہے اس دن سارا پڑھ لیتی ہوں۔

محمد شعیب نظامی، راولپنڈی...... آپ نے کشمیر نمبر شائع کر کے ہمارے اندر جذبہ جہاد پیدا کر دیا ہے۔

اسد بشیر، ایبٹ آباد...... کشمیر نمبر ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ خصوصاً "سفید گلاب" "راز" "ہمیں کپڑے نہیں اسلحہ چاہئے" "تم عظیم ہو" "یہ لوگ ایسے کیوں ہیں" اور "قرض اور فرض" نے بہت متاثر کیا۔

نوید احمد، نئی کراچی...... "کشمیر بنے گا پاکستان" میں خصوصاً "سفید گلاب" اور "ٹارچر سیل سے" بہت اچھی تحریریں تھیں۔ انشاء اللہ کشمیر ضرور آزاد ہو گا۔

فریدہ بروڑو، ٹھٹھہ، سندھ...... "کشمیر نمبر" کا جواب نہیں تھا۔ ساتھیوں کے وزیر اعظم بن کر کشمیر کو آزاد کرانے کے ارادے پسند آئے۔

محمد ایوب منظر، لاہور...... "کشمیر نمبر" کی قیمت میں آپ نے اضافہ کیوں کیا؟ کوئز کہانی کا سلسلہ اب بور ہو گیا ہے۔

○...... "کشمیر نمبر" میں صفحات زیادہ تھے اسی لئے قیمت

بڑھائی گئی۔ کوئز کہانی کا سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے۔

نور محمد، مروان..... میرا رسالہ اب تک نہیں پہنچا جبکہ مارکیٹ میں پہنچ چکا ہے۔

○ ..... ڈاک سے رسالہ پہنچنے میں کبھی کبھی دیر ہو جاتی ہے۔ صبر کیجئے۔

نوشین گل، کراچی..... آپ کے رسالے میں کہانیاں، سروے، جائزہ رپورٹیں، رنگین صفحات اور نگر نگر کی معلومات ہوتی ہیں۔ ان چیزوں نے آپ کے رسالے کو دوسرے رسالوں سے ممتاز بنا دیا ہے۔

○ ..... آپ کا خط اتنا طویل تھا کہ نقل نہیں جا سکا، لیکن آپ کی باتیں سچی ہیں۔

نیلوفر امان، بنوں سٹی..... میں نے جب سے کشمیر نمبر پڑھا ہے۔ ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی بھارتی فلمیں نہیں دیکھوں گی۔ بھارتی فلم اسٹاروں کی تصویریں جمع کرنے کی غلطی بھی اب نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب کشمیر پاکستان کا پانچواں صوبہ ہوگا۔

راجہ عابد حسین، کوٹلی، کشمیر..... آپ نے اپنے خاص نمبر کا عنوان دیا ہے۔ کشمیر بنے گا پاکستان، آپ کو ایسا کہنے کا کیا حق ہے کشمیر بھی ایک ملک ہے اور ہماری خود مختاری کو ختم کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟

○ ..... اگر کشمیر کے عوام متفقہ طور پر اعلان کر دیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں چاہتے تو ہمیں بھی اس کی خود مختاری پر اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن مقبوضہ کشمیر کے عوام جب پاکستان کا پرچم لہراتے ہیں تو ہم کیوں نا ان ہی کی خواہشوں کو "کشمیر بنے گا پاکستان" کا نام دیں۔

محمد عثمان سلیم قریشی..... "کشمیر نمبر" بہت آسان تھا۔ شاید کسی کو بھی مشکل محسوس نہ ہوا ہوگا۔

کلیم عرفان نیازی، منگھو پیر، کراچی..... "کشمیر نمبر" پڑھ کر احساس ہوا کہ ہم سچے مسلمان نہیں ہیں کیونکہ سچا مسلمان وہ ہوتا ہے جو اپنے بھائی کو مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اتنا اچھا نمبر نکالنے پر مبارک باد۔

محمد یاسر خان، پاکستان چوک، کراچی..... پچھلے سال اکتوبر میں مجھے آنکھ مچولی نے "بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں" پر چوتھا انعام دیا تھا لیکن انعام مجھے اب تک نہیں ملا۔

○ ..... ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہمارا بھیجا ہوا انعام آپ تک نہیں پہنچا۔ انعام آپ کو دوبارہ روانہ کر دیا جائے گا۔

طلحہ گجر، سرگودھا..... "کشمیر نمبر میں" "خوفناک سفر" اور "اگر مجھے وزیر اعظم بنا دیا جائے تو؟" پسند آئے۔ رسالہ بہت اچھا تھا۔

محمد رمضان منہاس، میاں چنوں..... کشمیر ایک نہ ایک دن ضرور آزاد ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ایسی ہی قربانی دینی پڑے گی جیسی پاکستان بنانے کے لئے دینی پڑی تھی۔

صائمہ الیاس، سرگودھا..... وزیر اعظم والے سروے میں سب سے اچھا جواب یہ تھا "ہم وزیر اعظم بنے تو قائد اعظم کے اس قول کو سچا ثابت کر دیں گے جان مسلم کعبہ سے محترم۔"

اظہر محمود، کوٹ قاضی..... رنگین صفحات کا معیار گر گیا ہے۔ انہیں بہتر بنانے پر توجہ دیں۔

عاصم رحمان، ہزارہ..... اگلی بار "مزاحیہ نمبر" شائع کریں۔

○ ..... قہقہہ نمبر دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ فی الحال تو ممکن نہیں ہے۔

جاوید اقبال عاجز، بہاولنگر..... آپ نے سگریٹ نوشی کے خلاف مہم کیوں ختم کر دی۔ اس کے لئے ایک صفحہ مخصوص کر دیجئے۔

○ ..... مہم ختم نہیں ہوئی ہے۔

عائشہ۔ پاکستان..... کشمیر نمبر پڑھا، اچھا بھی لگا مگر فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ فائدہ تو تب ہوتا جب ہم واقعی پاکستانی

مبارک باد

محترم ظفر محمود شیخ صاحب

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

"آنکھ مچولی" ایک بار پھر نمبر لے گیا" اخباری اصطلاح میں تو یہی سرخی لگنی چاہئے مگر یہ وہاں ہوتا ہے جہاں معاصرانہ چشمک اس عروج پہ ہو کہ کسی کے فوت ہونے پہ بھی لطیفہ سننا پڑے کہ لیجئے پھر نمبر لے گیا۔

طاہر مسعود صاحب کو ادارتی مبارک باد اور آپ کو انتظامی اور مالکانہ مبارک باد...... مجموعی طور پہ آنکھ مچولی ایک خوبصورت اور متوازن پرچہ ہے۔ توازن اور حسن اخلاق کی ایک اور بہت عمدہ مثال سلیم مغل صاحب کی رخصتی پہ وہ تحریر ہے جس میں انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے ہمارے ہاں اور اسلام آباد میں منعقدہ سیمنار کے شرکا میں بھی اس انداز کو نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ بہت سراہا گیا۔ تخلیق کار کی آمد پہ سبھی خوشی کا اظہار کیا کرتے ہیں اور جانے پہ ناراضگی کا بعض اوقات طعنوں اور شکایات کا بھی۔

آپ کے ادارے نے جس بڑے پن کا ثبوت دیا ہے اور جانے والے کو عزت اور وقار کے علاوہ دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا ہے، اس نے اسے اور بھی باوقار بنا دیا ہے۔

اختر عباس، مدیر ماہنامہ پھول، لاہور۔

ہوتے۔

محمد جاوید اسماعیل غوری، بلدیہ ٹاؤن، کراچی...... کشمیر نمبر چھاپ کر آپ نے عظیم کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اس سے آنکھ مچولی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

ممتاز حبیب صابر، مردان...... کشمیر بنے گا پاکستان کا شمارہ اوّل سے آخر تک آنسوؤں آہوں اور سسکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ آئندہ آپ حادثات نمبر شائع کیجئے۔

منزہ لیاقت، کوٹ ادو...... کشمیر نمبر سے یہ سبق ملا کہ آزادی یونہی پلیٹ میں رکھ کر نہیں ملتی، اس کے لئے قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

سید منیر آفاق، راولپنڈی...... آپ کوئی بھی مقابلہ کرائیں اس کی ۱۵ تاریخ مقرر کیا کریں تاکہ ہم سب شریک ہو سکیں۔

○ ...... بات یہ ہے کہ پرچے کی تیاری ۱۵ تاریخ تک بڑی حد تک ہو جاتی ہے اس لئے تاریخ ذرا پہلے کی دی جاتی ہے۔

محمد ارشد المہدیٰ، کراچی...... آپ نے جہاں اتنے نمبر نکالے ہیں وہاں "سائنس

ٹیکناوجی" نمبر بھی نکال دیں۔

ثمرین گل، (؟)..... میں نے آنکھ مچولی کو "ایک محب وطن طالبہ" کے حوالے سے ایک خط لکھا تھا۔ نام نہ چھپوانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم میں سچ بولنے کی جرأت نہیں ہے۔ جرأت نہ ہوتی تو مراسلہ بھیجتے کیوں۔ وجہ یہ تھی کہ نام چھپوانے کی اجازت امی جان نے نہیں دی تھی۔

محمد علی باری، کراچی..... "کشمیر نمبر میں میرے مضمون "تجھے مجاہدین سے خطاب" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "آج سے نصف صدی پہلے کشمیر کو انگریزوں نے ڈوگرہ راجہ کے ہاتھوں ۷۵ لاکھ میں بیچ دیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ کشمیر کو نصف صدی پہلے نہیں ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں نے بیچا تھا۔ میں اس غلطی پر معذرت خواہ ہوں۔

○..... ادارے کو بھی اس غلطی پر افسوس ہے۔

شاہد نواز خان، شیریں جناح کالونی کراچی..... سچ سچ بتائیں کہ کشمیر نمبر شائع کرنے کا خیال کس کو سب سے پہلے آیا۔

○..... سچی بات تو یہ ہے کہ تمام رسائل کو دعوۃ اکادمی کے "شعبہ بچوں کے ادب" نے کشمیر نمبر نکالنے کی دعوت دی تھی۔

عنایت اللہ اعوان، کندھ کوٹ..... کیا ہم امید کریں کہ کشمیر نمبر کا دوسرا حصہ بھی پیش کریں گے۔ جب "قہقہہ نمبر" اور "خوفناک نمبر" کے دو، دو شمارے پیش کر سکتے ہیں تو کشمیر نمبر کیوں نہیں؟

شہلا حسین، واہ کینٹ..... انکل! میں نے کچھ عرصہ پہلے وزیراعظم کو سگریٹ نوشی کے خلاف خط لکھا تھا۔ دیکھیں کیا بنتا ہے۔ میں زندگی کی آخری سانس تک سگریٹ کے خلاف لڑوں گی۔

محمد عابد، سانگھڑ..... کشمیر نمبر کی قیمت آپ نے دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کیوں کی ہے۔

○..... دس روپے میں اتنا ضخیم شمارہ پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیا اپنے کشمیر کے لئے آپ پانچ روپے زیادہ خرچ نہیں کر سکتے؟

حافظ عابد انور..... اتنا اچھا کشمیر نمبر نکالنے پر مبارک باد قبول کیجئے۔

ارم مبین آرائیں قاری پور، کراچی..... کشمیر نمبر کی چار پانچ کہانیاں پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ روشن مثال کا سلسلہ دوبارہ شروع کیجئے۔

غلام حسین میمن، حیدر آباد..... ایک مضمون "برکی کا ہیرو" ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے شائع کر دیں گے۔

○..... آپ ہمیں کوئی اور اچھا سا مضمون بھیجیں۔

خورشید انور، لانڈھی..... میں نے کشمیر نمبر کے سروے میں جواب بھیجا تھا۔ نام تو شائع ہو گیا لیکن میرا موقف شائع نہیں ہوا۔

○..... چونکہ جوابات بہت زیادہ تھے اسی لئے ملتے جلتے جوابوں کو ایک جواب بنا کر شائع کیا گیا۔ ممکن ہے الفاظ آپ کے نہ ہوں لیکن بات تو آپ ہی کی تھی۔

طارق محمود، واہ کینٹ، راولپنڈی..... میں نے اکثر دیکھا ہے کہ صبح کے وقت اسکولوں کے بس ڈرائیور اوور ٹیکنگ کرتے ہیں جس سے حادثے کا خطرہ ہوتا ہے۔

○..... یہ ذمہ داری اسکولوں کی انتظامیہ کی ہے کہ وہ ڈرائیوروں کی سرزنش کریں۔ اکثر حادثے اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔

منہاج احمد خان، بفرزون، کراچی..... میری آپ نے کوئی چیز شائع نہیں کی میں نے ایک رسالہ "آدرش" دیکھا ہے اس کے ایڈیٹر طاہر مسعود ہیں۔ کیا یہ آنکھ مچولی والے ہیں۔

○..... اچھی تحریر خود بخود چھپ جاتی ہے۔ جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے۔ مگر وہ اس رسالے کے ایڈیٹر نہیں نگراں ہیں۔

میرا چوچو شاد رہے

حاطب صدیقی

جونہی سورج چڑھتا ہے
چوزہ اٹھ کر پڑھتا ہے
پہلے "بسم اللہ" کہوں
چوں چوں، چوں چوں، چوں چوں چوں
اس کے بعد سبق یہ ہے
اپنے رب کا شکر کروں
کھانے پینے سے پہلے
چونچ رگڑ کر صاف کروں
اتنا کچھ ہے یاد مجھے
امی ! آگے کیا سیکھوں ؟
مرغی کُٹ کُٹ کرتی ہے
خوش ہو کر یہ کہتی ہے
میرا چوچو شاد رہے
جنم جنم آباد رہے
پڑھنے ہی سے عزت ہے
بات یہ بیٹا یاد رہے
جاہل لوگ زمانے میں
خوار ہوئے برباد رہے
سیکھیں اور سکھائیں جو
بن کر وہ استاد رہے
رہیو صاف، رہیو جگ جگ
دانہ کھا اور دُنکا چگ

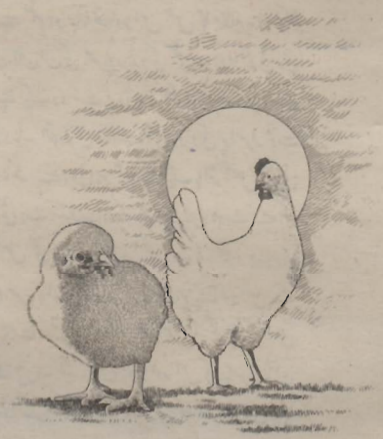

کرشمہ

قسط ۸

اظہر نیاز

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

جواد. ذیشان کا دوست تھا۔ وہ حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ جواد کو ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ آغا عمران نے اپنے ایک دوست پروڈیوسر انصاری صاحب، سے سفارش کر کے جواد کو ڈراموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انصاری صاحب بھی جواد کی پراسرار قوت سے بہت متاثر ہوئے ریہرسل کے دوران جواد کی ملاقات مس نائلہ سے ہوئی جو شہر کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھی۔ آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کا خیال تھا کہ نائلہ کا باپ. تخی بٹ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے مگر ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ انسپکٹر شعیب مسلسل تخی بٹ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چند پراسرار سے لوگ مسلسل جواد کے تعاقب میں تھے۔ وہ سرراہ اسے روک کر راستہ پوچھتے اور اس کے خلاف عمل کر کے جواد کی پیشن گوئیوں کا امتحان کرتے جو اکثر صحیح ثابت ہوتیں۔ پولیس ان افراد کی نگرانی کر رہی تھی جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ تخی بٹ کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن جواد اور اس کی چھوٹی بہن گڑیا اپنی سائیکلوں پر شام کی سیر کے لئے نکلے تو چند مشکوک افراد نے انہیں اغوا کر کے ایک محل نما عمارت میں پہنچا

دیا۔ محل کے مالک کا نام پرنس احسن تھا۔

ذیشان اور اجلال، جواد کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ شیدا پستول سے بھی ملے اور وہیں سے انھیں ایک پرچی ملی جس پر کوڈورڈز میں ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اجلال نے بڑی محنت سے اسے ڈی کوڈ کیا۔ مگر اس نمبر پر ایک پٹھان چوکیدار کے علاوہ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں آغا عمران گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ جس مجرم کو انسپکٹر شعیب نے بڑی محنت سے گرفتار کیا تھا کسی نے حوالات کے اندر اسے قتل کر دیا ہے۔

پرنس احسن نے بالآخر جواد کو بڑی مشکل سے اپنے لئے کام کرنے پر راضی کر لیا۔ جواد نے اپنی چھٹی حس کی بدولت پرنس احسن کا لاکھوں روپوں کا مال باآسانی نکلوا دیا لیکن ذیشان نے اپنی ذہانت سے معلوم کر لیا کہ جواد پرنس احسن کے قبضے میں ہے اور اس کے لئے کام کر رہا ہے۔ ادھر جواد اپنی بہن گڑیا کے ساتھ پرنس احسن کے محل نما مکان سے سخت جدوجہد کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایک ٹرک ڈرائیور سے لفٹ لینے کے چکر میں پکڑا گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے رومال سونگھا کر جواد اور گڑیا کو بے ہوش کر دیا اور تیزی کے ساتھ ٹرک چلا کر شیشے والے موڑ کی طرف چل پڑا۔ اسی اثناء میں ایک بس ٹرک کے قریب سے گزری۔ اس میں ذیشان اور اجلال بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے جواد اور گڑیا کو ٹرک میں چادر میں لپٹا دیکھ لیا۔

اب آگے پڑھیے.....

ٹھیک سات کلو میٹر کے بعد شیشے والا موڑ آیا تو ٹرک ڈرائیور نے ٹرک کو ایک طرف کھڑا کیا اور تین مرتبہ ہارن بجایا۔ کسی نا معلوم راستے سے ایک آدمی باہر آگیا۔ شکل و صورت سے ہی وہ شریف آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ کسی مشینی انداز میں چلتا ہوا وہ ٹرک کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خطرہ محسوس کرتے ہی ایک لمحہ میں مسلح ہو جائے گا۔ ٹرک ڈرائیور نے کہا۔

"ایک ٹلوا ایک ٹلوی، چھپر والا استاد سلام بولتا تھا۔"

"ٹھیک ہے" خوفناک آدمی نے کہا اور واپس مڑا۔ اتنے میں ایک جیپ ٹرک کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور ایک جیپ ٹرک کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ خوفناک آدمی فوراً زمین پر گر گیا اور کسی برمے کی طرح گھومتا ہوا جھاڑیوں کی طرف بھاگا لیکن جیپوں میں آنے والے لوگوں نے کسی کو مہلت نہ دی اور اندر بیٹھے بیٹھے انہوں نے خود کار اسلحہ سے گولیوں کی بارش کر دی۔ انہوں نے بیک وقت خوفناک آدمی، ڈرائیور اور اس کے کلینر کو نشانہ بنایا تھا۔ پلک جھپکتے میں تینوں کے جسموں میں مچھلیاں پکڑنے والے جال کی طرح سوراخ ہو گئے تھے۔ پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جیپوں سے دو (۲) آدمی اترے، انہوں نے بے ہوش جواد اور گڑیا کو اٹھایا اور اپنی جیپوں میں ڈال لیا۔ وہ اس تیزی سے واپس مڑے

کہ ٹائروں کے احتجاج سے پورا ماحول چیخ اٹھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ بس وہاں پہنچ گئی جس میں ذیشان اور اجلال سوار تھے۔ سڑک کے کنارے یہ خوفناک منظر دیکھ کر ڈرائیور نے بس روک دی۔ تمام مسافر طرح طرح کے تبصرے کرنے لگے۔ ذیشان نے ہجوم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹرک کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو اسے سیٹ پر ایک رومال پڑا ہوا ملا۔ جس پر بال پین سے کچھ لکھا ہوا تھا اور نقشہ سا بنا ہوا تھا۔ ذیشان نے فوراً وہ رومال اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا۔ اتنے میں کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ کسی نے اسے رومال اٹھاتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔!

"برخوردار!" ذیشان نے مڑکر دیکھا تو وہ ایک پولیس آفیسر تھا۔ "جاؤ، بس میں جاکر اپنے امی ابا کے پاس بیٹھو" اس کے ساتھ ہی اس نے تمام مسافروں سے کہا کہ وہ اس جگہ سے فوراً ہٹ جائیں اور پولیس انکوائری میں مداخلت نہ کریں۔ ذیشان، اجلال کے پاس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیب سے رومال نکال کر اجلال کو دکھانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" اجلال نے پوچھا۔

"یہ کونے پر نام دیکھ رہے ہو؟"

"ارے یہ تو جواد لکھا ہوا ہے۔"

"جی..... اس ٹرک میں جواد اور گڑیا سوار تھے۔ غالباً وہ اسمگلروں کے چنگل سے بھاگے ہوں گے لیکن دوبارہ پکڑے گئے۔ اس رومال پر پورا نقشہ بنا ہوا ہے۔ جہاں وہ قید تھے۔"

اجلال اور ذیشان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آگے جانے کی بجائے یہیں اتر جائیں اور نقشہ کے مطابق پیچھے چلیں تاکہ وہ جواد کے بتائے ہوئے راستے سے محل تک پہنچ جائیں۔ دونوں نے اپنے بیگ اٹھائے اور بس سے نیچے اتر آئے اور سامنے سڑک پر جاکر کھڑے ہو گئے تاکہ واپسی کے لئے سواری حاصل کر سکیں۔ پولیس آفیسر جو بار بار مسافروں سے جانے کے لئے کہہ رہا تھا اور اب ایک اور بس کے رکنے کی وجہ سے اور جھنجھلایا ہوا تھا اس کی نظر ان دونوں پر پڑی تو وہ ساری جھنجھلاہٹ بھول کر ان کے پاس آگیا۔

"تم دونوں اکیلے سفر کر رہے ہو"

"جی....."

تو اب تم بس سے اتر کیوں گئے؟"

"ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"اپنے گھر!"

"تو گھر سے بھاگے ہوئے ہو؟"

"جی نہیں....." ذیشان نے قدرے کرختگی سے کہا۔

"وہ تو خیر پتا چل جائے گا۔ جب رات تم لوگ تھانے میں گزارو گے۔ چلو میرے

ساتھ!"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ چل پڑے۔ اس نے دونوں کو لاکر پولیس گاڑی کے پاس کھڑا کر دیا۔

"تم دونوں اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں سمجھو"

ذیشان اور اجلال کی بس کے مسافران کو حیرت سے دیکھتے ہوئے اپنی اپنی سیٹوں پر دبک گئے جیسے قتل کے ذمہ دار یہ دونوں ہی ہوں۔ ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کی اور بھاگ لیا کہ اسے بھی پولیس نہ دھر لے۔

تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آگئی۔ لاشوں کو ایمبولینس میں رکھنے کے بعد پولیس آفیسر نے ذیشان اور اجلال کو پولیس گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا اور سیدھا تھانے میں لے آیا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں پوچھا.....

"ہاں تو برخوردار..... کیا نام ہے تم دونوں کا"

"جی میرا نام ذیشان ہے"

"اور میرا نام اجلال ہے"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے تھانے کے محرر کو بلایا۔

"ان دونوں کو لاک اپ میں بند کر دو اور آوارہ گردی میں ان کا چالان کر دو۔ رات اپنا مہمان رکھو۔ صبح ان کے ماں باپ کا پتا کریں

گے۔" محرر انہیں اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اتنے میں ایک انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

ذیشان اور اجلال رک گئے۔ چہرہ جانا پہچانا تھا۔

"ہاں تو کیا نام ہے تمہارا؟" پولیس آفیسر نے آنے والے انسپکٹر سے پوچھا۔

"جی..... شیدا پستول" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ وہ آغا عمران صاحب سے کہیں بلکہ عرض کریں کہ ابھی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آئی۔ جوں ہی آئے گی میں خود لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ اور اپنی رپورٹ بھی ساتھ ہی پیش کر دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے سر!" شیدا پستول مڑا، جوں ہی وہ مڑا اس کی نظر ذیشان اور اجلال پر پڑی اور اس نے ایک زور دار سیلوٹ ذیشان کو مارا۔

"میں ادھر بیٹھا ہوں۔" پولیس آفیسر نے انسپکٹر شیدا سے کہا۔

"جی ہاں..... لیکن میں نے سیلوٹ ذیشان صاحب کو مارا ہے۔"

"معلوم ہے ان کا آوارہ گردی میں چالان ہو چکا ہے۔"

"لگتا ہے آپ بھی نوکری سے تنگ آ گئے ہیں"

کیا مطلب؟"

"یہ آغا عمران کے بیٹے ہیں۔ ذیشان بابو۔"

یہ سنتے ہی وہ پولیس آفیسر بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور زور دار سیلوٹ سے ذیشان کو نوازا۔

ذیشان نے بھی جواباً سیلوٹ مارا اور کہنے لگا۔

"سر! آپ تشریف رکھئے۔ میں آغا عمران کا بیٹا ہوں، آغا عمران نہیں۔"

"جناب زمانہ نازک ہے۔ آج کے دور میں آغا عمران کی اولاد کو بھی سیلوٹ کرنا ضروری ہے۔"

پولیس آفیسر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ○ ..... ○ ..... ○

"ابو، یہ وہ رومال ہے جس پر جواد نے اس محل کا نقشہ بنایا ہے جس میں وہ قید ہے۔"

"جس میں وہ قید تھا۔" آغا عمران نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جواد اور گڑیا کو پکڑ کر دوبارہ اسی محل میں لے گئے ہوں۔ بہرحال اس نقشے کی مدد سے جنگل میں وہ محل تلاش کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے وہاں سے کچھ پتا چل جائے۔" آغا عمران نے فوراً انسپکٹر شعیب کو رومال کے بارے میں آگاہ کیا اور اسے گھر آنے کے لئے کہا، انسپکٹر شعیب وقت ضائع کئے بغیر آغا عمران کے گھر پہنچ گیا۔

"یہ تو مسئلہ بالکل حل ہو گیا۔" انسپکٹر شعیب

نے رومال کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے کہا....."
جواد نے راستوں کی نشاندہی کے لئے اسکاؤٹس کے نشان استعمال کئے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس نے ان رستوں پر بھی کسی نہ کسی طریقے سے نشان لگا دیئے ہوں گے۔ آپ حکم دیں تو میں اسمگلروں کے اس محل پر چھاپہ مارنے کے لئے روانہ ہو جاؤں۔

"میں نے تمہیں اسی لئے بلایا ہے" آغا عمران نے کہا۔ "میں نے ایس ایس پی راؤ اقبال سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ تمہاری ٹیم کے لئے ہر ممکن امداد کریں۔"

"ابو، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔" ذیشان نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"نو..... میں اور آپ دونوں نہیں جا رہے۔"

"انسپکٹر شعیب..... آپ پہلی فرصت میں روانہ ہو جائیں۔ یعنی زیادہ سے زیادہ کل۔"

○ ..... ○ ..... ○

جب پولیس پارٹی نقشہ کے مطابق جنگل کی خاک چھانتی محل تک پہنچی تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ محل بالکل خالی ہے۔ تمام محل کا جائزہ لینے پر پتا چلا کہ کوئی قدیم تاریخی عمارت ہے، جسے عرصہ ہوا استعمال نہیں کیا گیا۔ آغا عمران انسپکٹر شعیب سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اب وہاں کسی مجرم کا پایا جانا ناممکن ہے لیکن پھر بھی اس محل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ تمام تر تلاش کے باوجود وہاں سے ایک تنکا بھی ایسا نہ ملا جس پر آئندہ انکوائری کی بنیاد رکھی جا سکے۔

○ ..... ○ ..... ○

جواد اور گڑیا ایک مختصر سے کمرے میں قید تھے۔ گزشتہ مہم کے دوران ان کے کپڑے نہایت گندے ہو گئے تھے اور جگہ جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے۔ کمرے کے فرش پر دو بوریاں بچھی تھیں۔ جس پر وہ بیٹھ جاتے یا سو جاتے۔ کھانے کے وقت دروازہ کھلتا اور ایک بدتمیز سا آدمی کھانا لے کر آتا۔

"اے چھوکرا چھوکری کھانا کھاؤ۔"

"ہمیں منہ ہاتھ دھونا ہے۔"

"وہ ساتھ کے غسل خانے میں چلے جاؤ۔"

اور وہ دروازے سے باہر نکل کر ساتھ ہی بنے ایک غسل خانے میں چلے جاتے۔ دروازے کے ساتھ ایک بھیڑیا نما آدمی ہاتھ میں بندوق لئے بیٹھا ہوتا۔ انہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ یہ کوئی شہر ہے یا جنگل۔ ان سے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا گیا تھا کہ وہ کیوں بھاگے۔ آخر انہوں نے تنگ آ کر خود ہی اس بدتمیز آدمی سے کہا جو ان کے لئے کھانا لے کر آتا تھا۔

"ہم پرنس احسن سے ملنا چاہتے ہیں"

"ہم کسی پرنس احسن کو نہیں جانتا..... یہ لو کھانا کھاؤ۔" اور وہ باہر نکل گیا

"کیا یہ کوئی اور لوگ ہیں۔" گڑیا نے جواد سے پوچھا۔

"معلوم نہیں..... میرا تو خیال ہے یہ پرنس احسن ہی کے آدمی ہیں۔"

رات کو جب وہ پھر کھانا لے کر آیا تو جواد نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا کوئی باس ہے؟"

"ہم خود اپنا باس ہے۔"

"تو پھر سنو..... میں آپ لوگوں کے لئے کام کرنے کو تیار ہوں۔"

○ ..... ○ ..... ○

ذیشان اجلال کے ساتھ جواد کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ اس کی امی نے آکر بتایا کہ اس کا فون ہے کوئی مس نائلہ ہیں۔ وہ وہی تھیں جو چلڈرن کلب نامی ٹیلی ویژن پروگرام میں ایکٹنگ سکھاتی تھیں۔

"ہیلو..... مس نائلہ۔"

"ذیشان! جواد کا کچھ پتا چلا؟"

"جی نہیں۔"

"میں تمہارے ابو سے ملنا چاہتی تھی لیکن وہ تو بڑے آدمی ہیں۔ اگر تم ہمارے گھر آسکو..... یا میں تمہارے گھر آجاؤں؟"

"بات کیا ہے؟" ذیشان نے پوچھا۔

"ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتی..... بس ایک خبر ہے اور اہم خبر ہے۔" (جاری ہے)

محاورات کا جدید استعمال

اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ..... بقاء اللہ نے لکڑیاں کاٹتے کاٹتے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔

بال کی کھال نکالنا ..... جب بکرے کی کھال الگ کرنے میں قصائی کو دیر ہو گئی تو منے کی امی نے کہا جلدی جلدی کر، کیا بال کی بھی کھال نکال رہا ہے۔

منہ میں پانی بھر آنا ..... بارش کے دن جب چنو منہ کھولے آسمان کی طرف کھڑا تھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

کلیجہ ٹھنڈا ہونا ..... حمیدہ کی امی نے کہا کیا وہ کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہے جو بھون کر رکھا تھا۔

کانوں کو ہاتھ لگانا ..... مؤذن نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور اذان دینا شروع کی۔

غم غلط کرنا ..... ٹیچر نے املا چیک کرتے ہوئے "غم" غلط کر دیا۔

دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا ..... ڈاکٹر نے مریض کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو وہ چلا اٹھا۔

تن بدن میں آگ لگنا ..... جب ریاض صاحب اپنے ائر کنڈیشنڈ دفتر سے باہر آئے تو ان کے تن بدن میں آگ لگنے لگی۔

پیٹھ دکھانا ..... منو نے امی کو پیٹھ دکھاتے ہوئے کہا دیکھئے کیسی بڑی طرح ماسٹر صاحب نے مارا ہے۔

پانی پانی ہونا ..... کامران نے تھیلے میں سے برف نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ برف پانی پانی ہو گئی۔

مرسلہ ..... طلعت مسعود، لانڈھی۔

بوجھو تو جانیں

رُخسانہ احمد حُسین

سورج مغرب میں ڈوبا۔ اندھیرا پھیلا۔ گھر گھر میں چراغ جلنے شروع ہوئے۔ نوجوان اور بزرگ رات کا کھانا کے بعد گھر سے نکلے اور چوپال میں آن بیٹھے۔ گھروں میں ننھے بچوں نے نانی یا دادی اماں کو گھیرا اور کہانی سنانے کی فرمائش کی یا پھر پہیلیاں بوجھنے کا کھیل شروع ہوا۔

ٹی وی کے آنے سے پہلے تک یہ مناظر نہ صرف گاؤں میں بلکہ شہروں میں بھی کثرت سے دیکھے جاتے تھے۔ پہیلیاں بوجھنا نہ صرف ایک مرغوب کھیل ہوتا تھا بلکہ معلومات کی فراہمی کا ذریعہ اور اچھی خاصی ذہنی ورزش کا سامان بھی۔ آج کل یہ روایت کچھ دم توڑتی ہوئی سے معلوم ہوتی ہے۔ آنکھ مچولی اپنے ذہین قارئین کی دماغی غذا اور ایک اچھی روایت کے احیاء کے لئے پہیلیوں کا ایک سلسلہ شروع کر رہا ہے۔

"بوجھو تو جانیں" ایک انعامی سلسلہ ہو گا جس میں تمام پہیلیوں کے درست جوابات بھیجنے والے تین ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی قیمتی انعامات ارسال کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اچھی اچھی پہیلیاں بھیجنے والے ساتھیوں کو خوبصورت تحائف بھی دیئے جائیں گے۔ اس مرتبہ رخسانہ احمد حسین، حیدر آباد کی ارسال کردہ پہیلیاں شائع کی جا رہی ہیں۔ محترمہ رخسانہ احمد حسین کے شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ ہم گزارش کریں گے کہ وہ اپنا مکمل پتہ ہمیں ارسال کر دیں تاکہ ان کے تحائف ان تک پہنچائے جا سکیں۔

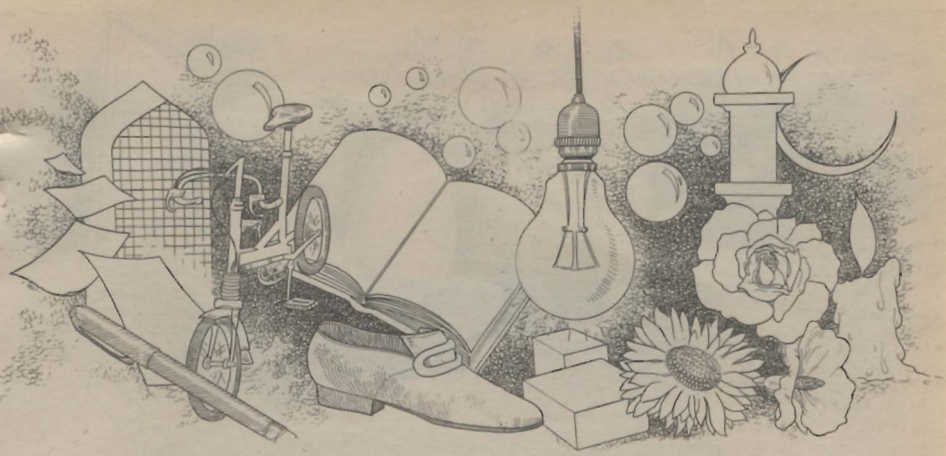

۱..... منہ کھولا کیا شکل بنائی
شکر کیا وہ جب بھی آئی

۲..... یہ شخص کچھ نہ پیسے نہ کھائے
دو ٹانگوں سے چلتا جائے

۳..... اس کے ہوتے کچھ نہ کھایا
جب کھایا اس کو نہ پایا

۴..... جس کے پاؤں کے نیچے آئے
کانوں سے وہ ہاتھ لگائے

۵..... تن کی لمبی سر کی چھوٹی
کردے سب کی بوٹی بوٹی

۶..... صدیوں کا ہے اک گلزار
پھول ہیں جس کے سدا بہار

۷..... شیشے کا گھر لوہے کا در
مٹکا سا پیٹ چھوٹا سا سر

۸..... جب بھی وہ کچھ لینے جائے
چیز آجائے خود نہ آئے

۹..... مخمل کے پردے خوشبو کا گھر
صبح سویرے کھلتا ہے در

۱۰..... چاندی کا پانی سونے کی گولی
ڈبیا سے نکلا جس نے بھی کھولی

۱۱..... ہر گھڑی بڑھائے آگے قدم
روکنے کا نہیں کسی میں دم

۱۲..... میرا پاؤں اس کا پیٹ
قدموں میں جاتا ہے لیٹ

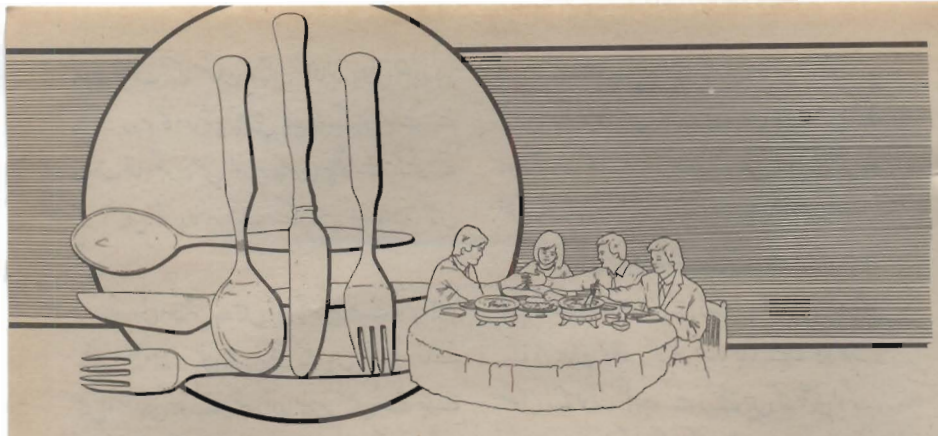

چھری، چمچے، کانٹے

دسترخوان پر کھانے چن دیئے گئے، برتنوں کی بہتات ہوئی تو اس کے بعد چمچے بھی آن پہنچے، اور چھریاں بھی چلنے لگیں!

ابتدائی زمانے کے انسان کو کھانے میں یہ سہولتیں میسر نہ تھیں۔ نہ وہ ان تکلفات کا قائل تھا۔ جو بھی ملتا، ناخنوں سے اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھاتا۔ اگر کسی چیز کو کاٹنے کی ضرورت پڑتی تو ہڈی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے یا سیپی کے کھردرے کناروں سے یہ کام لیتا۔ پھر اس نے پتھر کے تیز دھار والے ٹکڑوں سے یہ کام لینا شروع کر دیا۔ یہ پتھر پہلا چاقو ثابت ہوئے۔ اس وقت کا انسان سیپیوں اور درخت کی چھال سے چمچے کا کام لیتا۔ گوشت کے گرم پارچوں کو لکڑی سے اٹھاتا، اور پانی پینے کے لئے ہتھیلیوں سے اوک بنا لیتا۔

جب لوگوں نے بستیاں بسالیں اور برادری کی شکل میں رہنا شروع کیا تو ایک دوسرے سے میل جول بڑھا اور کھانے کے آداب کی ضرورت پڑی۔

کھانے کے آداب ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک، اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک بدلتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اب سے چند برس پہلے تک، فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے کا رواج عام تھا اور یہ دستور بہت پرانے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ قدیم یونان کے امراء آرام دہ گدوں پر نیم دراز ہو کر کھانا کھاتے، اور بچوں کے لئے بیٹھ کر کھانا کھانے کی شرط تھی۔ روم کے امرا عام طور پر ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے، مگر

بہت تکلف کے مہمان کو چمچہ، کانٹا اور خلال ضرور دیا جاتا۔ روم کا معاشرہ چھری کانٹے کے لوازمات سے واقف تھا، مگر خاص طور پر چھری چاقو اتنے مہنگے تھے کہ انہیں خریدنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

یوروپی معاشرے میں بھی چھری کانٹے عام نہیں تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں چاقو، چھریاں باورچی خانے میں استعمال ہوتے تھے، اور میز پر نہیں لے جائے جاتے تھے۔ کھانا عام طور پر ہاتھ سے ہی کھایا جاتا۔ جو ٹکڑے بچ جاتے وہ میز کے نیچے پھینک دیئے جاتے تھے، جہاں ان کو کھانے کے لئے خاص طور سے کتے پالے جاتے تھے۔ گوشت، روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر رکھ کر کھایا جاتا، اور گوشت کھانے کے بعد روٹی کے یہ ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کر دیئے جاتے۔ کھانے کے بعد مہمان، میز پوش سے ہاتھ اور منہ پونچھ لیتے۔

اطالیہ کے لوگ اپنے مزاج کے نفاست کے لئے مشہور تھے۔ فلورنس کے امرا نے نوالہ منہ تک لے جانے کے لئے کانٹے کا استعمال شروع کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی، یہ فیشن سارے یوروپ میں پھیل گیا۔ جو لوگ کانٹے خرید نہیں سکتے تھے، وہ خاص خاص موقعوں پر دوسروں سے مانگ تانگ کر کام چلاتے۔

کانٹے کی طرح چھری بھی دیر میں عام ہوئی۔ گھروں میں ایک سے زیادہ چھری نہیں ہوتی تھی، اس لئے مہمان اپنی اپنی چھری ساتھ لاتے۔ یہ چھری چاقو نیفے میں اڑسے ہوئے یا بیلٹ میں لگے ہوتے، اور کھانے کے علاوہ لڑنے کے وقت بھی باہر نکل آتے۔

چین میں پرانے زمانے ہی سے چھری کانٹے اور چمچے کے بجائے دو لمبی لمبی ڈنڈیوں کا رواج ہے جن کے درمیان نوالہ رکھ کر کھایا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ تعجب سے دیکھتے ہیں کہ چینی لوگ، دو ڈنڈیوں سے کیسے کھانا کھاتے ہیں۔

ہمارے دسترخوان پر چھری اور چمچے کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چمچہ اصل میں ترکی زبان کا لفظ ہے، اور بادشاہوں کے زمانے میں شوربہ، شربت یا کسی رقیق چیز کے پینے کے ظرف کا نام تھا۔ انگریزوں کی عمل داری کے ساتھ ساتھ اس کا رواج بڑھتا گیا اور اسے جدید تہذیب کی نشانی سمجھا جانے لگا۔

پیٹ کا درد

نیوزی لینڈ کے جیل میں ایک نوجوان نے پیٹ کے درد کی شکایت کی۔ سرجن نے آپریشن کر کے اس کے پیٹ سے پانچ چھوٹے چمچے، تین چھریاں، دو چھریوں کے بلیڈ، ایک قلم اور تاروں کے دو ٹکڑے نکالے۔

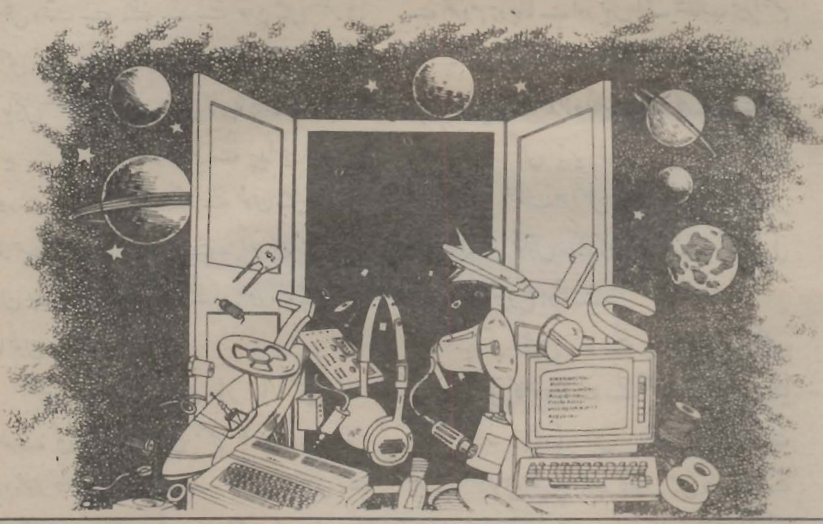

دریچہ

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

ایاز محمود

س..... شدید غصے کی حالت میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ غصہ کرنے والے شخص کا منہ سرخ ہو جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

سید اشرف الدین۔ کراچی۔

ج..... ہمارے جسموں میں ایڈرینالن نامی مادہ پایا جاتا ہے جو دراصل ایک ہارمون ہے۔ یہ مادہ گردوں کے اوپر واقع غدود میں سے نکلتا ہے جنہیں ایڈرینل غدود کہا جاتا ہے۔ غصہ یا خوف کی حالت میں یا ایسی صورتِ حال میں جب انسان کو کسی چیلنج کا فوری طور پر سامنا ہو، ایڈرینالن غدود سے نکل کر ہمارے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔

اس مادہ کی خون میں موجودگی کی وجہ سے جگر

کے افعال میں تیزی آجاتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی مشکل وقت سے نمٹنے کے لئے خون میں شکر کی فراہمی بڑھ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خون کی شریانیں سکڑ جاتی ہیں۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے حد تو یہ ہے کہ کسی ممکنہ زخم سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نپٹنے کے لئے خون میں جمنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور خون جلدی نہ جمے تو زخم لگنے کی صورت میں بہت سا خون ضائع ہوجائے۔

مختصراً یہ کہ غصے، ڈر یا کسی ممکنہ خطرے کی صورت میں جسم کا مدافعتی نظام خود بخود کام کرنے لگتا ہے۔ سانس کا تیزی سے چلنا اور چہرے کا سرخ ہونا دراصل اس بات کی پہچان ہے کہ آپ کا جسم مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہے۔

س..... کوئلے اور ہیرے کے کاربن ایک جیسے ہوتے ہیں تو ان میں اتنا فرق کیوں ہے؟

ذیشان اظہر چودھری؟ رحیم یار خان۔

ج..... آپ نے ٹھیک کہا! کوئلہ اور ہیرا دراصل کاربن ہی کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ زیر زمین کاربن کے ٹکڑے کو اگر بہت زیادہ حرارت اور دباؤ میسا ہو جائے تو رفتہ رفتہ یہ ہیرے میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ حرارت سے کاربن اپنی ٹھوس حالت چھوڑ کر مائع میں تبدیل ہوجاتا ہے اور دباؤ سے اس کی قلمیں بن جاتی ہیں۔ ہیرا اسی شکل میں پایا جاتا ہے جسے ہم قلم یا کرسٹل کہتے ہیں۔

حرارت اور دباؤ کے اس عمل میں کاربن سیاہ رنگت سے محروم ہوجاتا ہے اور یوں ایک شفاف ہیرا جنم لیتا ہے جس کا شمار نہایت قیمتی پتھروں میں کیا جاتا ہے۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ کاربن سے ہیرا بننے کا یہ عمل زیر زمین تقریباً پچھتر میل کی گہرائی میں مختلف مراحل طے کرتا ہے۔ بعد میں مختلف قدرتی قوتوں کے زیر اثر ہیرے کا اوپر کی طرف سفر شروع ہوتا ہے۔

آپ کی دلچسپی کے لئے یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہیرا صنعتی کاموں کے لئے بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عموماً اس مقصد کے لئے ہیرے مصنوعی طور پر تجربہ گاہوں میں بنائے جاتے ہیں جہاں کاربن پر شدید حرارت اور دباؤ کا عمل کیا جاتا ہے۔

س..... لیوکیمیا کیا بیماری ہے؟ وضاحت کیجئے؟

یاسمین رحمت۔ ساہیوال۔

جواب..... لیوکیمیا خون کے سرطان کو کہتے ہیں۔ ان کی کئی اقسام ہیں۔ بعض اقسام میں مبتلا مریضوں کی شفایابی کا تناسب سو فیصد ہے۔ خون کے سرطان کے وجہ جسم میں مخصوص حالات کی بنا پر سفید خون کے خلیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ سفید خلیوں کی پیداوار میں اس اضافے کی وجہ یہ ہے کہ نہایت کم عمر اور ناپختہ خلیات جنہیں بلاسٹ خلیے کہا جاتا ہے بڑی تعداد میں خون میں شامل ہوجاتے ہیں۔

خون کے سرطان کے بارے میں حتمی طور پر کہنا

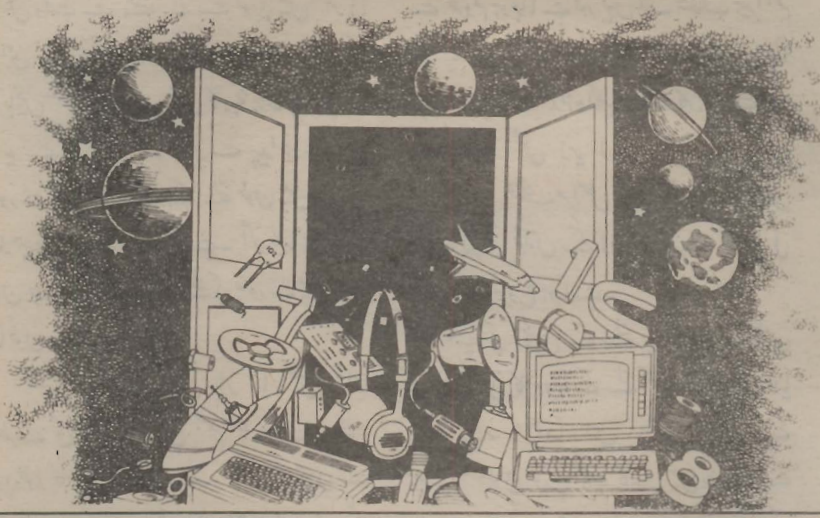

درِ حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

ایاز محمود

س...... شدید غصے کی حالت میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ غصہ کرنے والے شخص کا منہ سرخ ہو جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

سید اشرف الدین۔ کراچی۔

ج..... ہمارے جسموں میں ایڈرینالن نامی مادہ پایا جاتا ہے جو دراصل ایک ہارمون ہے۔ یہ مادہ گردوں کے اوپر واقع غدود میں سے نکلتا ہے جنہیں ایڈرینل غدود کہا جاتا ہے۔ غصہ یا خوف کی حالت میں یا ایسی صورتِ حال میں جب انسان کو کسی چیلنج کا فوری طور پر سامنا ہو، ایڈرینالن غدود سے نکل کر ہمارے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔

اس مادہ کی خون میں موجودگی کی وجہ سے جگر

کے افعال میں تیزی آجاتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی مشکل وقت سے نمٹنے کے لئے خون میں شکر کی فراہمی بڑھ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خون کی شریانیں سکڑ جاتی ہیں۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے حد تو یہ ہے کہ کسی ممکنہ زخم سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نپٹنے کے لئے خون میں جمنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور خون جلدی نہ جمے تو زخم لگنے کی صورت میں بہت سا خون ضائع ہوجائے۔

مختصراً یہ کہ غصے، ڈر یا کسی ممکنہ خطرے کی صورت میں جسم کا مدافعتی نظام خود بخود کام کرنے لگتا ہے۔ سانس کا تیزی سے چلنا اور چہرے کا سرخ ہونا دراصل اس بات کی پہچان ہے کہ آپ کا جسم مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہے۔

س..... کوئلے اور ہیرے کے کاربن ایک جیسے ہوتے ہیں تو ان میں اتنا فرق کیوں ہے؟

ذیشان اظہر چودھری؟ رحیم یار خان۔

ج..... آپ نے ٹھیک کہا! کوئلہ اور ہیرا دراصل کاربن ہی کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ زیر زمین کاربن کے ٹکڑے کو اگر بہت زیادہ حرارت اور دباؤ مہیا ہوجائے تو رفتہ رفتہ یہ ہیرے میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ حرارت سے کاربن اپنی ٹھوس حالت چھوڑ کر مائع میں تبدیل ہوجاتا ہے اور دباؤ سے اس کی قلمیں بن جاتی ہیں۔ ہیرا اسی شکل میں پایا جاتا ہے جسے ہم قلم یا کرسٹل کہتے ہیں۔

حرارت اور دباؤ کے اس عمل میں کاربن سیاہ رنگت سے محروم ہوجاتا ہے اور یوں ایک شفاف ہیرا جنم لیتا ہے جس کا شمار نہایت قیمتی پتھروں میں کیا جاتا ہے۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ کاربن سے ہیرا بننے کا یہ عمل زیر زمین تقریباً پچھتر میل کی گہرائی میں مختلف مراحل طے کرتا ہے۔ بعد میں مختلف قدرتی قوتوں کے زیر اثر ہیرے کا اوپر کی طرف سفر شروع ہوتا ہے۔

آپ کی دلچسپی کے لئے یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہیرا صنعتی کاموں کے لئے بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عموماً اس مقصد کے لئے ہیرے مصنوعی طور پر تجربہ گاہوں میں بنائے جاتے ہیں جہاں کاربن پر شدید حرارت اور دباؤ کا عمل کیا جاتا ہے۔

س..... لیوکیمیا کیا بیماری ہے؟ وضاحت کیجئے؟

یاسمین رحمت۔ ساہیوال۔

جواب..... لیوکیمیا خون کے سرطان کو کہتے ہیں۔ ان کی کئی اقسام ہیں۔ بعض اقسام میں مبتلا مریضوں کی شفایابی کا تناسب سو فیصد ہے۔ خون کے سرطان کے وجہ جسم میں مخصوص حالات کی بنا پر سفید خون کے خلیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ سفید خلیوں کی پیداوار میں اس اضافے کی وجہ یہ ہے کہ نہایت کم عمر اور ناپختہ خلیات جنہیں بلاسٹ خلیے کہا جاتا ہے بڑی تعداد میں خون میں شامل ہوجاتے ہیں۔

خون کے سرطان کے بارے میں حتمی طور پر کہنا

بہت مشکل ہے کہ یہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ تاہم اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس بیماری کا براہ راست تعلق انسانی جسم پر تابکاری کے اثرات سے ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد وہاں کے باشندوں میں خون کے سرطان کے مرض میں مبتلا ہونے کا تناسب بہت بڑھ گیا تھا جس کی صاف وجہ ایٹمی تابکاری تھی۔

س..... ایکس ریز کیا ہیں؟ تفصیل سے بتایئے؟

جاوید احمد خان۔ ملتان۔

ج..... ایکس ریز دراصل برقی مقناطیسی شعاعیں ہیں جن کا طول موج بہت کم ہوتا ہے۔ یہ شعاعیں روشنی کی شعاعوں کے برخلاف ٹھوس اجسام کے پار گزرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایکس شعاعوں کا سب سے بڑا استعمال طب اور جراحی کے شعبہ میں ہے۔ ایکس شعاع سے بننے والی تصویر میں جسم کا اندرونی ڈھانچہ باآسانی دیکھا جاسکتا ہے جس سے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی تشخیص ہوجاتی ہے۔ اس طریقے سے جسم کے دیگر اعضا مثلاً معدہ اور آنتیں وغیرہ بھی بڑی خوبی سے دیکھے جاسکتے ہیں اور ان کے درست مقام اور حالت کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں جس سے مرض کی تشخیص اور علاج میں بہت سہولت ہوجاتی ہے۔

ایکس شعاعوں کی ایجاد کا سہرا ایک جرمن سائنس دان پروفیسر روئنجن کے سر ہے جنہوں نے جنوری ۱۸۹۶ء میں ان شعاعوں کو دریافت کیا۔ ان شعاعوں سے اور بہت سے کام بھی لئے جاتے ہیں مثلاً انہیں ہوائی جہاز سازی کی صنعت میں کام میں لایا جاتا ہے اور ان کی مدد سے ہوائی جہاز کے فولادی ڈھانچے میں خرابیوں کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

س..... مئی ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شمسی توانائی سے چلنے والی کار کے بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر اس کے متعلق بتائیں کہ یہ کیسے چلتی ہے۔

عبدالحفیظ۔ مخدوم پور پہوڑاں۔

ج..... شمسی توانائی سے چلنے والی گاڑیوں کی چھت پر شمسی خانے یا سیلز لگے ہوتے ہیں۔ یہ شمسی خانے سورج کی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ گھنٹوں تک اس برقی توانائی کو محفوظ کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ گاڑی اسی توانائی کو بطور ایندھن استعمال کرتی ہے۔ لہٰذا اس میں پیٹرول یا کسی اور ایندھن کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ کچھ عملی دقتوں کی وجہ سے شمسی توانائی سے چلنے والی گاڑیاں باقاعدہ عوامی سطح پر مقبول نہیں ہیں۔ لیکن ان پر مستقل کام ہو رہا ہے۔ اور امید ہے کہ مستقبل کی گاڑی شمسی توانائی کی مرہونِ منت ہوگی۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب سے چند برس پہلے کراچی میں واقع جامعہ این ای ڈی کے تین طلبہ نے شمسی توانائی سے چلنے والی گاڑی بنائی تھی۔ اس کا نام سولر سامبا تھا۔

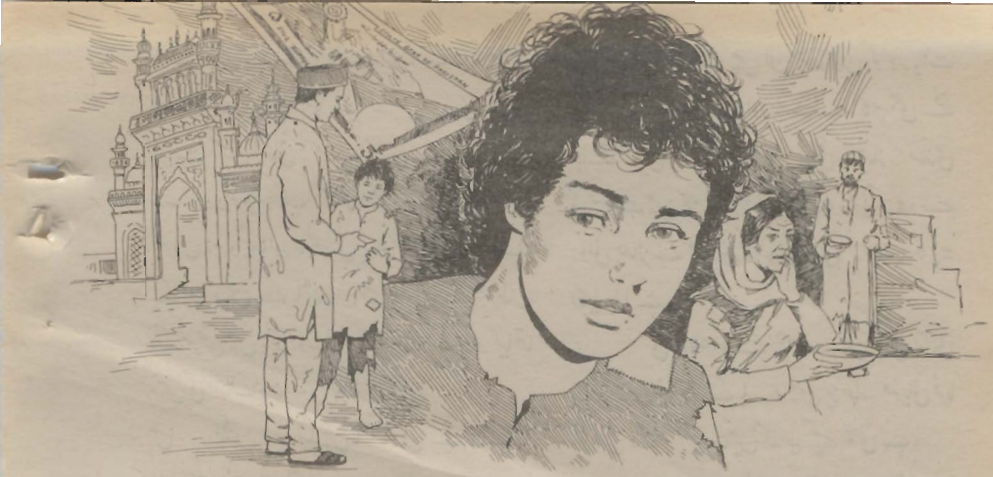

کنبہ

مجیب ظفر انوار

"اگر ماسو نہ ہوتی تو اتنی بڑی دنیا میں کون میرا سہارا بنتا، میں کس کے ساتھ رہتا؟"

یہ خیال اکثر میرے ذہن میں کلبلاتا ہے اور پھر اس کا جواب بھی میرے ذہن میں روشن ہو جاتا ہے کہ "ماسو جیسی بھی ہے میرے لئے اس دنیا میں ایک ایسا سائبان ہے جو بوسیدہ ہونے کے باوجود بھی بارش سے کسی حد تک محفوظ رکھ سکتا ہے۔"

ماسو کی شخصیت بڑی عجیب بلکہ پراسرار ہے! لیکن ذرا ٹھہریئے۔ میں نے آپ سے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میرا نام ماسو نے "یاسو" رکھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو پہلا چہرہ ماسو ہی کا دیکھا۔ ماسو ایک سخت گیر بھکارن ہے! اکثر "اچھی بھیک" کی خاطر بڑی بڑی کوٹھیوں کی صفائی بھی کر دیتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم ماسو نے میری پرورش کیوں کی؟ مجھے کہاں سے لائی؟ یا وہی میری ماں ہے، مجھے ان سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ ماسو کا سب سے بڑا احسان مجھ پر یہ ہے کہ اس نے مجھے پال پوس کر گیارہ برس کا کر دیا ہے اور ندقر چاچا کی صحبت نے بقول ماسو! "میرے جہن (ذہن) کو کھوب (خوب) کھراب (خراب) کر دیا ہے!" بہرحال ندقر چاچا میرے لئے بہت کار آمد اور سب کے

لئے ایک ہوشیار بھکاری ہے۔ منٹوں میں اپنے ہاتھ پیریوں ٹیڑھے میڑھے کرلیتا ہے جیسے پیدائشی پولیو کا مریض ہو۔ بہت ظالم ہے لیکن مجھ سے خوب محبت کرتا ہے کہتا ہے کہ اگر اس کی کوئی اولاد ہوتی تو میرے جیسی ہوتی۔ وہ شہر کے معزز علاقے میں بھیک مانگتا ہے، اور مجھے بھی معزز لوگوں سے بھیک مانگنے کے طریقوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہتا ہے۔ ہمارے پورے پاڑے میں دو ہی کی بے تاج بادشاہت ہے۔ ندقر چاچا کی اور ماسو کی۔

ماسو کو پاڑے کے فقیروں کے علاوہ کوئی دوسرا ایک نظر ہی دیکھ لے تو اسے ابکائی آجائے۔ میں لفظوں میں ماسو کے وجود کی کراہیت بیان نہیں کرسکتا۔ لیکن اتنا سمجھ لیجئے کہ ہے بہت مکروہ صورت۔ ماسو شروع شروع میں مجھے بہت پیٹا کرتی تھی لیکن جب سے میں چالی رپے (چالیس روپے) روز کے روز کما کے اس کی ہتھیلی پر رکھنے لگا ہوں اس کا رویہ بدل گیا ہے۔ اب وہ میرے سر پر اپنا میلا کچیلا ہاتھ پھیرتی ہے اور مجھے گلے لگالیتی ہے۔ اس کے لباس کی بدبو کا میں عادی ہو گیا ہوں اور جب وہ مجھے اپنی طرف محبت سے کھینچتی ہے تو میں فوراً اس کے گلے لگ جاتا ہوں، کیوں کہ وہ "ماسو" ہے بھکاری پاڑے کی بے تاج ملکہ۔

ان دنوں ماسو نے جامع مسجد کے آگے والی فٹ پاتھ کی زمین کا کچھ حصہ قادے کو خوب اچھی رقم دے کر خریدا ہے لہٰذا میں اور ماسو ہر جمعے کو نماز کے بعد آتے جاتے نمازیوں سے بھیک مانگتے ہیں۔ یہاں ہماری اچھی خاصی معقول کمائی ہو جاتی ہے۔ کسی بھی نمازی کو دیکھتے ہی ماسو زمین پر اوندھی ہو جاتی ہے اور.....

"اے بابو۔ اے کھدا کے نیک بندے، دے اللہ کے نام پہ۔ دے اللہ کے نام پہ..... کچھ بھی دے، آنا دو آنا..... پائی دھیلا ..... دے اللہ کے نام پہ!"

ماسو "دے اللہ کے نام پہ" اتنے رقت آمیز لہجے میں کہتی ہے کہ مجھے بھی رونا آجاتا ہے، وہ زمین پر گھسٹتی ہوئی نمازیوں کے پیر پکڑ لیتی ہے چنانچہ نیک دل انسانوں کی وجہ سے اس کی خوب کمائی ہو جاتی ہے۔ ماسو مجھے خرچ (کرنے) کے لئے روزانہ ایک رپیا دیتی ہے میں روپے کو بڑ کے درخت کے نیچے ایک سوراخ میں احتیاط سے ڈال دیتا ہوں، یہ سوراخ بہت اچھا بینک ہے یہاں میرا تمام سرمایا محفوظ ہے۔ جب میں اور بڑا ہو جاؤں گا تو پڑھنا سیکھوں گا اور سارے پیسے نکال کر خوب اچھی اچھی کتابیں لا کر پڑھوں گا۔

کل جمعہ تھا، نماز کے بعد ماسو تو نمازیوں کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی دور چلی گئی..... میں مسجد کے احاطے میں آگیا۔ نمازی بہت زیادہ تھے۔ حتیٰ کہ وضو بنانے والی جگہ پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں ایک بابو جی کے پاس گیا اور اپنی قمیص کا دامن دانتوں سے کھینچتے ہوئے التجائیہ لہجے میں کہا!

"اے بابو ..... اللہ تجھے سلامت رکھے، اللہ کے نام پر مجھے ایک روپیا دے!"

وہ ایک نوجوان شخص تھا۔

میری آواز سن کر اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور پھر نرمی سے بولا۔

"نماز ادا کرلوں تو گھر چلنا، میں پیسے ساتھ نہیں لایا!"

لیکن میں تاڑ گیا کہ یہ موٹا مرغا بہانہ کر رہا ہے۔ "اے بابو ..... دے نا روپیا اللہ کے نام پہ، اللہ تیری جوانی سلامت رکھے ..... اللہ تیری نماز قبول کرے ..... دے اللہ کے نام پہ!" میں نے نہایت بے تکلفی سے نوجوان کے صاف ستھرے پاکیزہ دامن کو کھینچ کر ماسو کے سکھائے ہوئے جملے دہرائے۔

وہ عجیب آدمی تھا بجائے ناراض ہونے کے مسکرا اٹھا اور بولا "اچھا اچھا آؤ ..... مسجد میں باتیں نہیں کرتے ہیں، میرے ساتھ آؤ!" اتنا کہہ کر وہ میرے ساتھ مسجد سے باہر نکل آیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کا گھر قریب ہی تھا مجھے باہر ٹھہرا کر وہ اندر گیا، اپنا بٹوہ لایا اور پانچ کا نوٹ نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ اس عرصے میں، میں آتے جاتے راہ گیروں کے لئے صدا لگا رہا تھا۔ "اللہ والو کوئی کھانے کو دے، آئے کوئی کھانا کھلا دے، محتاج کے بچے کو کھانا کھلا ..... اے اللہ والو۔ ہے کوئی اللہ والا، یا اللہ ہے کچھ کھانے کے لئے!" پانچ کا نوٹ تھامتے ہی میرے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ کسی بھی راہ گیر نے دھیلا نہ دیا۔ بے حس کہیں کے اور ایک یہ بابو تھا پانچ روپے دے دیئے۔

"بابو جی میری وجہ سے آپ کی نماز نکل گئی!" میں نے کہا۔ وہ میرا بدلہ ہوا لہجہ محسوس کر کے چونکا۔ پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "کسی بھکاری کے ہتھے چڑھ گئے تھے کیا؟"

"ہاں" بابو جی میں نے جواب دیا۔ "ندقر چاچا نے مجھے بات کرنی سکھائی ہے وہ بہت تہذیب یافتہ فقیر ہے۔" یہ سن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر اچانک کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے سفید سفید دانت چمکنے لگے۔

"تہذیب یافتہ فقیر؟ منے ..... میں مسجد میں جس کی عبادت کر رہا تھا تمہاری خدمت بھی اسی کی عبادت ہے کیوں کہ تم بھی، میں بھی، اور سارے آدمی، ساری مخلوق اسی کا تو کنبہ ہے۔"

"کیا مطلب بابو جی؟" میں کچھ نہ سمجھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "مطلب یہ کہ میں نے پہلے اس کی حمد و ثنا کی پھر اسی کے کنبے کے ایک فرد کی خدمت کی، اب اسی کی بقایا عبادت دوبارہ اسی کے گھر جا کر کروں گا!"

"کیا مطلب بابو جی ..... میں سمجھا نہیں!" میں بالکل بوکھلا گیا۔ کنبے کا چکر میری سمجھ میں نہیں

آرہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے پرسکون لہجے میں بولا "جب جان جاؤ گئے تو خود ہی سمجھ جاؤ گے!"

نہ جانے کس لہجے میں اس نے بات کہی تھی؟ بہرحال میں بدستور حیران و پریشان تھا۔

پھر اچانک..... اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مامو کے بدبو دار وجود کی ناقابل برداشت بو میرے ارد گرد بس گئی ہے، بدبو سے میرا دم گھٹنے لگا..... میں نے بے قرار ہو کر اسے آواز دی! "بابو جی ٹھہریئے، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" وہ ٹھہر گیا۔ پلٹ کر مجھے دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر بولا! "لیکن منے میں تو مسجد جارہا ہوں!" "ہاں ہاں..... مجھے بھی ساتھ لے چلو! میں بھی آپ کے ساتھ....." آنسوؤں نے میری بات پوری نہ ہونے دی اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پانچ کا نوٹ مجھ سے چھین کر پاس سے گزرتے ہوئے ایک بھکاری کو دے دیا۔

"آؤ چلو!" اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

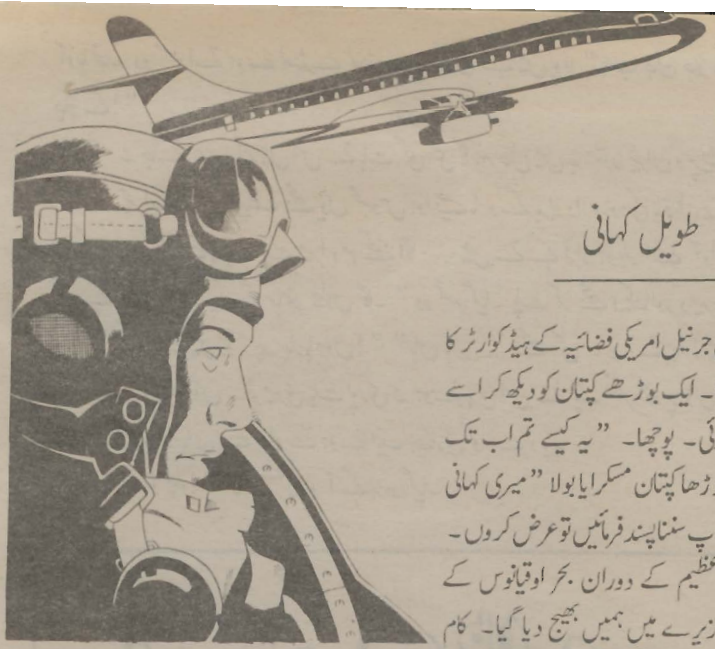

طویل کہانی

ایک امریکی جرنیل امریکی فضائیہ کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کرنے گیا۔ ایک بوڑھے کپتان کو دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی۔ پوچھا۔ "یہ کیسے تم اب تک کیپٹن ہو"؟ بوڑھا کپتان مسکرایا بولا "میری کہانی طویل ہے۔ آپ سننا پسند فرمائیں تو عرض کروں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران بحر اوقیانوس کے عین بیچ ایک جزیرے میں ہمیں بھیج دیا گیا۔ کام ہمارا یہ تھا کہ خطرے کی گھنٹی بجتے ہی ہوائی جہاز اڑانا ہے اور دشمن کا سامنا کرنا ہے۔ روزانہ آدھی رات کو گھنٹی بجتی۔ ہم سب آنکھیں ملتے اور گالیاں دیتے ہوئے اڈے کی طرف بھاگتے۔ وہاں سگنل آتا کہ یہ محض پریکٹس کے لئے کیا گیا تھا۔ یوں نیندیں حرام ہونے سے میں بہت اکتایا اسی عرصہ میں میری ایک بن مانس سے "یاری" ہو گئی۔ وہ کودتا، پھاندتا میرے کمرے میں آگھستا۔ رفتہ رفتہ میں نے اسے آداب سکھائے۔ میز پر بیٹھ کر کھانا سکھایا۔ ایک روز اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ یہ کام اسی سے لوں۔ تاکہ میری دقت دور ہو۔ اب میری سب مشکلیں حل ہو گئیں۔ روزانہ رات کو گھنٹی بجتی۔ بن مانس میری وردی پہنتا اور ہوائی اڈے کی طرف دوڑ جاتا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں سگنل آنے پر لوٹ آتا۔ میں بڑے مزے سے پڑا سوتا رہتا۔ ایک رات ٹیک آف کا سگنل بھی آگیا۔ بن مانس مجھ سے پہلے آگے جا چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ٹرنک سے دوسری وردی نکالی اور بھاگم بھاگ ہوائی اڈے کی طرف دوڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جہاز اوپر اٹھ رہا ہے اور بن مانس بڑے اطمینان سے بیٹھا ہے۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ اب کیا ہو گا؟

"پھر کیا ہوا؟" جرنیل نے بے صبری سے پوچھا۔ "ہوتا کیا" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بس اب وہ ونگ کمانڈر ہے اور میں کیپٹن۔"

پاکستان کوئز کون جیتا

ادارہ

اگست کے شمارے میں ہم نے ساتھیوں سے پاکستان اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے بیس سوالات کئے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت سے جوابات موصول ہوئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ساتھیوں نے ان مشکل سوالوں کے جوابات بہت محنت اور مطالعے کے بعد مرتب کر کے ہمیں بھیجے۔

لیکن افسوس کے تمام جوابات کسی ساتھی کے بھی درست نہیں پائے گئے۔ تاہم ہم نے ایک غلطی کرنے والے دو ساتھیوں کو انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان خوش نصیبوں کے نام یہ ہیں:

۱..... محمد شریف ظفر، کنگن پور۔

۲..... فہمینہ برڑو، مکلی ٹھٹھہ۔

دو یا دو سے زائد غلطیاں کرنے والے ساتھیوں کے نام:

انعم جیلانی، پشاور۔ محمد عامر، کراچی۔ نوتن شہزادی، جڑانوالہ۔ عادل زاہد، کراچی۔ ذیشان ندیم۔ علی اصغر، ساہیوال۔ محسن علی رضوی۔ اظہر حسن، میر پور آزاد کشمیر۔ غلام الحسن رضوی، مردان۔ اشفاق احمد ناز، کراچی۔ محبت رسول، کھاریاں۔ فہد عمران، کراچی۔ حسن رشید، راولپنڈی۔ حسن فرخ، لاہور۔ سعید احمد چشتی، سکھر۔ قدسیہ کاظمی، سکھر۔ جمشید عالم، ٹیکسیلا۔ محمد ظاہر، مردان۔ ممتاز الدین احمد، کراچی۔ عابدہ ملک، ملتان۔ سید عاطف و کاشف حیدری، اسلام آباد۔ آئی اے جعفری، گجرات۔ سیما رانی، حیدر آباد۔ عظمیٰ رحمان، حیدر آباد۔ محمد عامر شہزاد، لاہور۔ سعدیہ صدیقی۔ علی فرہاد حمید، لاہور۔ کامران ایوب، کراچی۔

صحیح جوابات

۱..... "دو قومی نظریہ" کا مفہوم یہ ہے کہ

برصغیر میں ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں جن کا مذہب، تہذیب اور ثقافت ایک دوسرے سے یکسر جدا ہے۔ ۲۔ یہ تصور سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۷ء میں پیش کیا جب ہندوؤں نے اردو کی مخالفت اور ہندی زبان کی حمایت میں تحریک چلائی۔ ۳۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے طور پر وجود میں آئی۔ ۴۔ مسلم لیگ کا نام نواب سلیم اللہ خاں نے تجویز کیا۔ ۵۔ پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب برصغیر میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا یہ الفاظ قائداعظم کے ہیں۔ ۶۔ پاکستان کا نام چوہدری رحمت علی نے تجویز کیا تھا۔ ۷۔ پاکستان کے نام میں جو حروف ہیں ان میں سے حرف "پ" پنجاب سے" الف افغانیہ سرحد سے "ک" کشمیر سے "س" سندھ سے اور بلوچستان سے تان لیا گیا۔ جس کا مطلب ہے پاک جگہ۔ ۸۔ قراردادِ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مولوی فضل الحق نے پیش کی۔ ۹۔ قراردادِ پاکستان میں پاکستان کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ ۱۰۔ قیامِ پاکستان کا اعلان ۳ جون دوپہر دو بجے ۱۹۴۷ء کو کیا گیا تھا۔ ۱۱۔ پاکستان کی موجودہ کل آبادی ساڑھے دس کروڑ ہے۔ ۱۲۔ پاکستان کا کل رقبہ ۷۹۶۰۹۶ مربع کلومیٹر ہے جبکہ شمالی علاقوں کا رقبہ شامل کرنے کے بعد پاکستان کا کل رقبہ ۸۶۸۵۹۱ ہو جاتا ہے ۱۳۔ "پاکستان میں جغرافیائی محل وقوع۔ جغرافیائی اصطلاح میں پاکستان" ۳۰ء ۲۳ سے ۴۵ء ۳۶ شمالی عرض بلد اور ۶۱ سے ۳۱۔ ۷۵ مشرقی طول بلد کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں چین، شمال مغرب میں افغانستان، مشرق میں بھارت اور جنوب میں بحرۂ عرب ہے۔ ۱۴۔ پاکستان میں اب تک تین گورنر جنرل چھ صدرِ مملکت اور گیارہ وزرائے اعظم گزرے ہیں ("ان میں موجودہ صدر اور وزیراعظم شامل نہیں ہیں)۔

گورنر جنرل ......(قائداعظم، خواجہ ناظم الدین، غلام محمد) صدر ...... اسکندر مرزا، محمد ایوب خان، آغا محمد یحییٰ خاں، ذوالفقار علی بھٹو (مختصر مدت کے لئے) فضل الٰہی چوہدری، محمد ضیاء الحق) وزیراعظم ......(لیاقت علی خان خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، چوہدری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، ملک فیروز خان نون، ذوالفقار علی بھٹو، محمد خان جونیجو، بے نظیر بھٹو، غلام مصطفےٰ جتوئی (نگراں وزیراعظم۔)

۱۵۔ پاکستان میں خواندگی کی شرح ۲۶ فیصد ہے۔ ۱۶۔ پاکستان ۹۰۔ ۱۹۸۹ء کے جائزے کے مطابق پاکستان میں فی کس آمدنی ۸ ہزار ایک سو نوے روپے سالانہ ہے۔ ۱۷۔ پاکستان میں ۲۲ جامعات ہیں۔ ۱۸۔ پاکستان میں پانچ بڑے دریا دریائے سندھ، چناب، راوی، ستلج اور جہلم بہتے ہیں۔ ۱۹۔ پاکستان اقوامِ متحدہ، دولتِ مشترکہ، غیر جانبدار ممالک کی تحریک سارک اور اسلامی کانفرنس جیسے عالمی اداروں اور تنظیموں کا رکن ہے۔ ۲۰۔ پاکستان میں اب تک تین دستور ۱۹۵۶، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء میں بن چکے ہیں۔

حوصلوں کی جیت

تحریر: یے شڈ تھاؤ ۔ ترجمہ: سیّد کاشان جعفری

میری پیدائش انگلینڈ کے ایک کارخانے میں ہوئی...... پھر بعد میں چینی عوام کی خدمت کے لئے میں چین آگیا۔ میرا پیٹ بہت بڑا ہے، سیاہ چمکدار کوئلے کے بڑے بڑے ٹکڑے مزدوروں کے ذریعہ میرے پیٹ میں ڈلوا کر میرے پیٹ کی آگ بجھائی نہیں، بھڑکائی جاتی ہے۔ میرے آٹھ پہیے ہیں، جو میرے پیروں کا کام انجام دیتے ہیں تو اس وقت میری رفتار سے کوئی بھی تیز رفتار گھوڑا مقابلہ نہیں کر سکتا...... میری ایک بڑی سی آنکھ ہے، جس کی مدد سے میں رات کے گھور اندھیرے میں بھی دور، دور تک دیکھ سکتا ہوں، میری آواز بہت زیادہ تیز ہے،جب میں سیٹی بجاتا ہوں تو اس کی آواز سن کر راستے میں کھڑے پیڑ، پودے بھی تھر، تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ چین میں رہتے ہوئے مجھے کئی سال،ہو گئے ہیں۔ میں شنگھائی سے نانکنگ اور نانکنگ سے شنگھائی آتا جاتا رہتا ہوں۔ اس راستے سے میں اتنی اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں کہ دونوں شہروں کے درمیان زمین کے ہر حصے کو آنکھ بند کر کے بھی پہچان، سکتا ہوں، ٹھیک ٹھیک وہ جگہ تک بتا سکتا ہوں جہاں بانسوں کا ایک جھرمٹ ہے اور اسی کے پیچھے ایک بوڑھا کسان اپنی بیوی کے ساتھ چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اور تو اور میں پتھر کی اس پُلیا کے

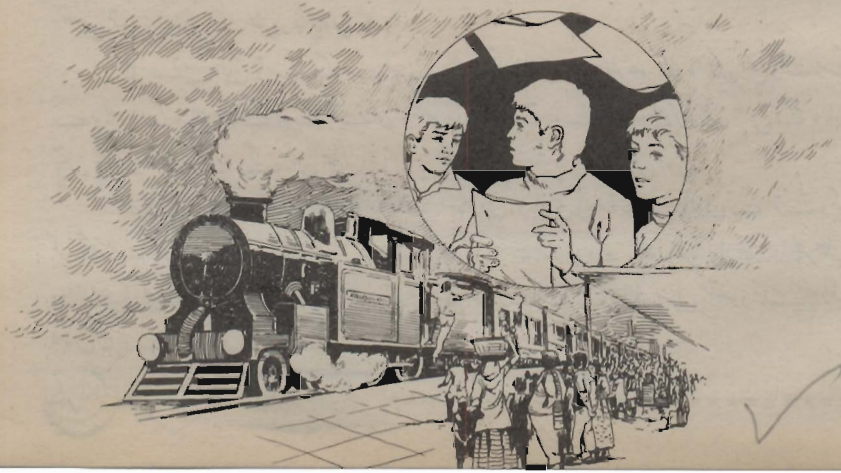

متعلق بھی آپ کو بتا سکتا ہوں جہاں مچھیرے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں جن کی خدمت انجام دیتا ہوں ان سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ وہ سب بڑے نیک دل لوگ ہیں۔ ان میں طلبا و طالبات، دفاتر اور کارخانوں کے کارکن سودا سلف لینے جانے والے گھریلو لوگوں کے علاوہ ایک ضعیف العمر خاتون بھی ہے۔ جو اپنی ٹوکری میں تحائف کی مختلف اشیاء رکھے، اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے عموماً جاتی رہتی ہے۔

کبھی کبھی میری زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جب میری مسکراہٹ، میری خوشیاں کہیں کھو جاتی ہیں، اور میں ایک دم اداس و سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ کل ہی کا بات ہے میں اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ میرا پیٹ لبالب کوئلوں سے بھرا جا چکا تھا، اور میں اپنے سفر پر روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اچانک دو، تین ہزار طلبہ و طالبات بھاگتے ہوئے اسٹیشن کے اندر داخل ہوئے ان سب نے اسکول کی یونیفارم زیب تن کی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے اس طلبہ گروہ کی یاد آگئی جنہوں نے جاپانی حملے کی مخالفت میں شنگھائی میں بڑی بہادری کے ساتھ اپنا لوہا منوایا تھا۔ یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے وہ طلبہ اور طالبات اس قدر باہمت اور حوصلہ مند لگ رہے تھے کہ اگر ان پر پہاڑ بھی گر پڑتا تو ان کے قدم نہ ڈگمگاتے...... ان کی گفتگو سے میں سمجھ گیا کہ وہ کسی قومی مسئلے کے سلسلے میں فکر مند ہیں۔ اور ان کی خواہش ہے کہ میں انہیں لے کر اس مقام تک پہنچا دوں جہاں وہ کچھ لوگوں کے سامنے اپنے نظریئے، اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔

"آؤ، آؤ...... ساتھیو"...... میں نے دل ہی دل میں کہا اور یہ سوچتے ہوئے کہ جب وطن خطرے میں ہو تو طلبہ و طالبات کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لئے لے جانا، عام طلبہ و طالبات کو اسکول پہنچانے، کسانوں، کارکنوں، مزدوروں کو کھیت، کارخانوں اور دفاتر پہنچانے سے کہیں زیادہ اہم کام ہے۔ بھلا میں ان کی مدد کرنے سے کیوں کر انکار کر سکتا تھا۔ "آؤ میرے بچو۔ میں تمہیں تمہاری منزل تک ضرور پہنچاؤں گا۔"

میں نے سیٹی بجائی تو سب کے سب میرے پیچھے لگے ڈبوں میں سوار ہو گئے، عین اسی وقت بہت سے پولیس کے سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور دھکم دھکا کرتے ہوئے وہ بھی ڈبوں میں گھس گئے، اور چیخ، چیخ کر احکام دینے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ گاڑی اپنے سفر پر روانہ نہیں ہوگی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ مسافروں کو مایوسی کی حالت میں ڈبوں سے اترتے دیکھ کر مجھے بہت گہرا صدمہ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے کسی بہت بھاری بوجھ تلے دبا دیا گیا ہے...... پھر طلبہ و طالبات کی ملی جلی آوازوں کا شور فضا میں بلند ہوا، وہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے بغیر ڈبوں میں سے نیچے نہیں اتریں گے۔

یہ سن کر ان کے جواب میں میں نے خوشی سے سیٹی بجائی..... میں ان سے کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھ میں تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانے کی ہمت اور قوت ہے، مگر دوسرے ہی لمحے میں ایک نئی اور انوکھی مشکل سے دو چار ہو گیا۔ جب پولیس سے کچھ اور کرتے بن نہ پڑا تو انہوں نے ریلوے اسٹیشن کے گرد گھیرا ڈال دیا، اب مجھے یہ محسوس ہونے لگا جیسے کسی مقابلے یا کسی جنگ کی تیاری ہو رہی ہو۔ بڑا ہی عجیب و غریب سا منظر تھا اس وقت۔

پھر میں نے دیکھا اسٹیشن کی حدود میں ایک اور گروہ داخل ہوا ہے۔ ان کے چہروں پر غصے اور فکر کے آثار ہیں۔ ان میں بوڑھے، عمر رسیدہ اور کچھ جوان بھی شامل ہیں۔ یہ سب طلبہ و طالبات سے گفتگو کرنے کے لئے ان کے ڈبوں میں گھس گئے۔ میں صاف صاف ان کی باتیں نہیں سن سکا۔ اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے آپس میں کیا گفتگو کی۔ لیکن طلبہ نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک لفظ مجھے بالکل صاف سنائی دیا۔ ان کا ایک ہی کہنا تھا کہ ہم اپنی منزل تک پہنچے بغیر ڈبوں میں سے نیچے نہیں اتریں گے۔

یہ سن کر میں نے پھر خوشی میں سیٹی بجائی، لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جب میں اپنے ان طلبہ کو ان کی منزل تک پہنچانے کے لئے بخوشی تیار ہوں تو ان پولیس والوں کو درمیان میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے..... اس طرح کئی گھنٹے بیت گئے۔ میں کسی ست اور کاہل انسان کی طرح یوں ہی کھڑا تھا۔ آخر یہ کیا بے تکی بات ہے۔ مجھے کام، کام اور کام ہی پسند ہے۔ اور یہ لوگ مجھے گھیرے کھڑے ہیں، میں تو کیا، ہر محنت پسند ایسی صورتحال سے جلد اکتا جاتا ہے۔

ہوؤ ... میں نے پھر سیٹی بجا کر آگے بڑھنا چاہا لیکن میرے پہیوں میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ میں اداس ہو گیا۔ غم سے میرا دل بوجھل ہو گیا، مگر عین اسی وقت ڈرائیور آپہنچا۔ اس نے اپنے تجربہ کار ہاتھوں سے میری مشین چلا دی۔

واہ..... اب میں فوراً ہی اپنے سفر پر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو سکتا ہوں۔ میں ان طلبہ و طالبات کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے پھر ایک لمبی سیٹی بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

آخر ہم لوگوں نے کامیابی حاصل کر لی، کامرانی نے ہمارے قدم چوم لئے۔ طلبہ نے کامیابی کی خوشی میں ایک نعرہ فضا میں بلند کیا اور میری رفتار میں تیزی آگئی۔ میرے بھاری پہیوں کے نیچے آہنی پٹریاں تیزی کے ساتھ پیچھے سرکتی جا رہی تھیں۔ ارد گرد کے درخت بڑی تیزی سے پیچھے بھاگ رہے تھے، اب میں اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ دوڑتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

اچانک ڈرائیور نے ایک آلے کو نیچے گرا دیا۔ اس کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کوئی طاقت مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ میری رفتار ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ مدہم ہونے لگی۔ آخر کار مجھے ایک جھٹکا کھا کر رک جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ میں نے سامنے کی طرف دیکھا تو وہاں ایک چوڑی ندی بڑی بے نیازی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔

طلبہ اور طالبات بھی بڑی بے چینی سے جھانک جھانک کر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں بھی یہاں گاڑی رکنے کا سبب نہیں آرہا تھا۔ آخر وہ چیخنے لگے "ہمیں یہاں کیوں روکا گیا ہے۔ جب تک ہم اپنے مقررہ مقام تک نہیں پہنچ جاتے، کہیں درمیان میں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اور پھر دس بارہ طالب علم رکنے کا سبب جاننے کے لئے میرے پاس آئے اور ڈرائیور کو وہاں موجود نہ پا کر سمجھ گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو اصل صورت حال بتانے کے لئے فوراً واپس لوٹ گئے۔

"ڈرائیور کو تلاش کرو..... اس کا پتا لگاؤ..... ابھی وہ اس جگہ سے کوئی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا،" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہر ڈبے میں جا جا کر اس کی تلاش شروع کر دی۔ اور پھر ان کی یہ جستجو کامیاب ہوگئی..... انہوں نے گمشدہ ڈرائیور کو آخر تلاش کر ہی لیا۔ وہ ڈائننگ کمپارٹمنٹ کے کچن کی الماری میں گٹھری کی صورت بنا بیٹھا تھا۔ طلبہ اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئے اور اسے فوراً گاڑی چلانے کا حکم دیا۔

میرا وہ پرانا دوست یعنی ڈرائیور، اپنے اس کئے پر بے حد پشیمان تھا۔ شرم سے اس کی نگاہیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ آسمان ٹوٹ پڑے، یا زمین پھٹ جائے اور وہ شرمندگی سے بچنے کے لئے اس میں سما جائے، مگر یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے اس کی یہ حالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی لجاحت سے کہا..... "میرے بچو، میرے دوستو..... میں مجبور ہوں، گاڑی اور آگے نہیں لے جا سکتا۔"

"کیوں؟" ..... ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں" ..... "میرے افسروں کا یہی حکم ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ "تو پھر تم نے اسٹیشن سے گاڑی کیوں چلائی؟" ..... "وہ بھی اپنے افسروں کے حکم کی تعمیل کی تھی" ..... "اچھا!..... تو یہ بات تھی، لیکن اب تم یہ بالکل بھول جاؤ کہ تمہارے افسروں کا حکم کیا ہے۔ تم انجن اسٹارٹ کرو۔ ورنہ ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دو" ..... طالب علم ڈرائیور کو دھکیلتے ہوئے میرے کیبن تک لے آئے۔ اچانک اس کی آنکھیں بھر آئیں..... آنسو اس کی پلکوں پر

تیرنے لگے..... اور پھر تیزی سے باہر نکل کر رخساروں پر لڑھک گئے۔ "اگر میں گاڑی یہاں سے آگے لے گیا تو بطور سزا مجھے گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے گا پھر میرے اہل خانہ کا کیا ہو گا؟"

"اوہ یہ تو واقعی بہت ہی بُری بات ہوگی۔" کچھ طلبہ نے اس کے ساتھ ہمدردی کی..... وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ " ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے جس کی وجہ سے اس بے قصور شخص کی جان ہلاکت میں پڑے۔ ہم میں سے کچھ ساتھی انجینئرنگ کے طالب علم بھی ہیں انہیں انجن کی مشینری سے متعلق تھوڑی بہت معلومات ہیں۔ آؤ ان کی مدد سے ہم خود ہی انجن چلانے کی کوشش کریں۔"

اور پھر طلبہ نے جیسے تیسے کوشش کر کے میری مشین چلا دی۔ ایک بار پھر میرے بھاری پہیوں تلے آہنی پٹریاں پیچھے کی طرف سرکنے لگیں۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور میں اپنی مخصوص رفتار سے ان باہمت اور حوصلہ مند طالب علموں کو اپنی آغوش میں لئے بھاگا چلا جا رہا تھا، جو کسی قومی مسئلے کے حل کے لئے سفر کر رہے تھے۔

اچانک میں نے دیکھا، کہ میرے آگے کا راستہ ٹوٹا ہوا ہے، کافی دور تک پٹریاں غائب ہیں۔ میں آنے والے حادثے کے احساس سے لرز کر رہ گیا۔ لیکن میرا رک جانا خود میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں نے پوری قوت سے سیٹی بجائی "ہووؤ......... ہووؤ"

اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔ ایک طویل قد کے طالب علم نے فوراً بریک لگا دیئے۔ شاید وہ میرا پیغام سمجھ گیا تھا۔ پھر گاڑی اکھڑی ہوئی پٹریوں سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ جب طلبہ کو یہ معلوم ہوا کہ ہم سب ایک خطرناک جان لیوا حادثے کے منہ میں جانے سے بال بال بچے ہیں، تو وہ اصل معاملے کی تحقیق کے لئے نیچے اتر آئے۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ انہوں نے میری ایک آنکھ کی روشنی میں دیکھا کہ کچھ پٹریاں اپنی جگہ سے غائب ہیں..... "آؤ، ہم سب مل کر پٹریاں تلاش کریں۔" کسی طالب علم نے مشورہ دیا۔ اس کی آواز پر دوسرے طلبہ فوراً اِدھر اُدھر بکھر گئے اور نصف گھنٹے تک غائب شدہ پٹریوں کو تلاش کرتے رہے، مگر کامیابی نہ ہوئی..... گھڑی کی سوئیاں بغیر رکے، بغیر کسی کا انتظار کئے اپنا سفر طے کرتی رہیں۔ مزید نصف گھنٹہ گزر گیا: پھر ندی کی طرف سے کسی طالب علم نے چیخ کر کہا........... "یہاں آؤ.......... یہ اِدھر ہیں پٹریاں....." سب اس آواز کی طرف دوڑے، ندی کا پانی سردی سے جم کر برف بن چکا تھا اور اس برف میں سے وہ پٹریاں جھانک رہی تھیں، طلبہ کی ٹولی نے پٹریوں کو برف میں دبا ہوا دیکھا اور ہمت مرداں، مدد خدا کے مصداق، اپنی مدد آپ، کرتے ہوئے پٹریوں کو نکالنے کی جدوجہد کرنے لگے۔

ایک ایک کر کے پٹریاں نکال لی گئیں، ندی کے یخ برفیلے پانی میں ان کے جوتے، موزے بھیگ گئے..... پیروں اور پنڈلیوں کی ہڈیاں تک ٹھنڈ سے ٹھٹھر کر رہ گئیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی اس کی پروا نہیں تھی۔

اس کے بعد جب انہوں نے لکڑی کے سلیپروں پر پٹریوں کو لا کر رکھا تو معلوم ہوا کہ پٹریوں کو آپس میں ملا کر جوڑنے والے نٹ، بولٹ بھی غائب ہیں۔ یہ ایک نیا مسئلہ اور نئی پریشانی تھی۔ "میرے خیال میں وہ بھی وہیں قریب ہی مل جائیں گے، جہاں پٹریاں برف میں دبی ملی ہیں۔" ایک آواز آئی۔ "ٹھیک ہے۔ چلو، وہیں تلاش کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سب پھر ادھر ہی چلے گئے اور جلد ہی ان کی جدوجہد رنگ لے آئی۔ ایک ایک کر کے سارے ہی نٹ بولٹ انہیں وہاں سے مل گئے۔ اب وہ سب پھر پٹری جوڑنے میں مصروف تھے۔ ان کی ہمت، لگن اور حوصلہ دیکھ کہ میرا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ میرا سینہ فخر سے چوڑا، اور سر بلند ہو گیا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہوا ہم پھر آگے بڑھنے لگے ..... ابھی ہمارے سفر کو ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ معلوم ہوا آگے پھر وہی صورت حال درپیش ہے جس سے ہم پیچھے نبرد آزما ہو چکے تھے..... آگے اور پٹریاں غائب تھیں..... ایک بار مجھے پھر رکنا پڑا..... ایک بار پھر پہلے جیسی صورت حال سے دو چار تھے..... وہ سب پھر ادھر ادھر مختلف ٹولیوں میں بٹ کر گمشدہ پٹریوں کو تلاش کرنے لگے مگر بے سود۔ اس بار کامیابی جیسے ان سے روٹھ گئی تھی..... مگر انہوں نے ہمت ہارنا یا حالات کے آگے سپر ڈالنا تو جیسے سیکھا ہی نہیں تھا۔ بڑے غور و فکر کے بعد یہ تجویز سامنے آئی کہ کچھ لڑکے پیچھے جائیں اور وہاں سے پٹریاں کھول کر آگے آئیں۔ تجویز پر عمل مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں..... پھر یہ بھی کہ ہمت ہار کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کہ بیٹھ جانے سے بہتر یہ تھا کہ مشکل سے نجات پانے کی کوشش کی جائے۔

باہمت لڑکوں کی کئی ٹولیاں پیچھے جا کر پٹریاں کھول لائیں، جنہیں تازہ دم لڑکوں نے ٹوٹی ہوئی پٹریوں کی جگہ رکھ کر فٹ کر دیا۔ وہ سب مل جل کر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں نے ان کی ہمت، عزم اور حوصلے کو سلام کیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا، جن کا عزم فولاد کو بھی پگھلا دے انہیں آگے بڑھنے سے کون روک سکتا ہے، ایسی رکاوٹیں بھلا ان کا راستہ کیسے روکیں گی..... اور پھر میں نے دیکھا انہوں نے اپنے راستے کی اس بڑی رکاوٹ کو بھی دور کر دیا۔ میری سوچ کو ان کے عمل نے سچ ثابت کر دکھایا تھا..... سیاہ رات ڈھل چکی تھی..... نیا سورج طلوع ہو رہا تھا، عزم و حوصلے کی نئی صبح لے کر۔ اور ایک بار پھر ہم سب اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے.....

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کمسن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کیلئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلمکار کا نام پتہ درج نہ ہوگا اسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کمسن قلمکار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلمکار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کمسن قلمکار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

سیاچن گلیشیئر

عظمت علی خان۔کوہاٹ

"سیاچن" بلتی زبان کا لفظ ہے اور اسکے معنی ہیں۔ "جنگلی گلاب"
بلتستان پاکستان کا حصہ ہے اور سیاچن کے ارد گرد آباد لوگوں کی زبان بلتستانی ہے۔ اس علاقے میں پاکستان کی کرنسی چلتی ہے۔ سیاچن پاکستان کا دوسرا بڑا گلیشیر ہے۔ یہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ تمام جگہ برفیلی ہے۔ سخت سردی میں درجہ حرارت منفی تیس سے منفی پچاس ڈگری تک رہتا ہے۔ سخت گرمی کے موسم میں بھی یہاں کی سردی برداشت نہیں ہوتی۔ سیاچن گلیشیر کشمیر کی طرف سے سولہ سے بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پاکستان کی طرف سے سیاچن گلیشیر تک جانے کے لئے گلگت سے "اسکردو" اور "اسکردو" سے آگے "ڈم سم" کا میدانی علاقہ آتا ہے۔ یہاں سے سیاچن گلیشیر ۱۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ڈم سم سے آگے "گوما" کا علاقہ آتا ہے پھر "درہ سالتورہ" پھر "درہ بیلا فونڈا۔" اس کے بعد "درہ گیانگ" سے ہوتے ہوئے

سیاچن تک جایا جاتا ہے۔

سیاچن کے محاذ پر فوجیوں کے لئے "فائبر گلاس" کے چھوٹے خیمے نصب ہیں۔ اس جگہ ایک فوجی جوان کو جو وردی پہننے کے لئے دی جاتی ہے اس کی قیمت چار ہزار ڈالر ہوتی ہے، یعنی تقریباً ۹۶ ہزار سے لیکر ایک لاکھ پاکستانی روپے۔ یہاں جوتے بھی خاص قسم کے پہنے جاتے ہیں جو امریکہ سے منگوائے جاتے ہیں۔ ایک جوڑے کی قیمت آٹھ ہزار ڈالر ہوتی ہے جو تقریباً دو لاکھ پاکستانی روپوں کے برابر ہے۔ یہ وردی اور جوتے بمشکل چھ ماہ چلتے ہیں۔ پھر تبدیل کر دئے جاتے ہیں۔ فائبر گلاس کے خیموں میں مسلسل مٹی کے تیل کا چولہا جلتا رہتا ہے کیونکہ اگر یہ احتیاطی تدابیر نہ کی جائیں تو یہاں انسان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

۱۹۸۳ء میں بھارت نے سیاچن کا جائزہ لینے کے لئے ایک خفیہ فوجی دستہ بھیجا تھا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں باقاعدہ طور پر یہاں فوجی چوکیاں قائم کرلیں۔ پاکستان کو اس کی بروقت خبر نہ ہو سکی۔ پھر ایک دن ایک پاکستانی کوہ پیما محمد حفیظ نے اس علاقے میں بھارتی فوجیوں کو کیمپ لگاتے دیکھا تو چپکے سے واپس آکر فوجی ہائی کمان کو اطلاع دی۔ جس پر پاکستانی فوج کے مجاہدوں نے فوری کاروائی کی اور سیاچن پر باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ سیاچن میں پاکستانی سرفروشوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں کہ پورا پاکستان ان پر فخر کر رہا ہے۔ یہاں اس قدر برف باری میں جوانوں کے ہاتھ پاؤں ضائع ہو جاتے ہیں مگر شوقِ شہادت اور حبِ وطن سے سرشار مجاہد اف تک نہیں کرتے اور بدستور اپنی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی فرض شناسی کی مدت پوری ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے مجاہد ان کی جگہ لینے پہنچ جاتے ہیں۔

سیاچن پاکستان کا حصہ ہے اور پاکستانی مجاہدین بھارتی فوجیوں کے دانت کھٹے کر رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق بھارت کا نقصان یہاں یومیہ ۵ کروڑ روپے ہو رہا ہے اور مالی نقصان کے ساتھ ساتھ اس کے جوانوں کا مورال بھی گر رہا ہے۔ جبکہ پاکستان کا نہ صرف نقصان بھارت سے کم ہے بلکہ پاکستانی فوجیوں کے حوصلے بھی بلند ہیں۔

پاکستانی مجاہدین اس بات پر بھارتی فوجیوں کے دانت کھٹے کر رہے ہیں کہ "پاکستان ہمارا ہے" اور سیاچن پاکستان کا حصہ ہے ہم اپنی پاک دھرتی پر ناپاک بھارتی قدم کیوں برداشت کریں؟

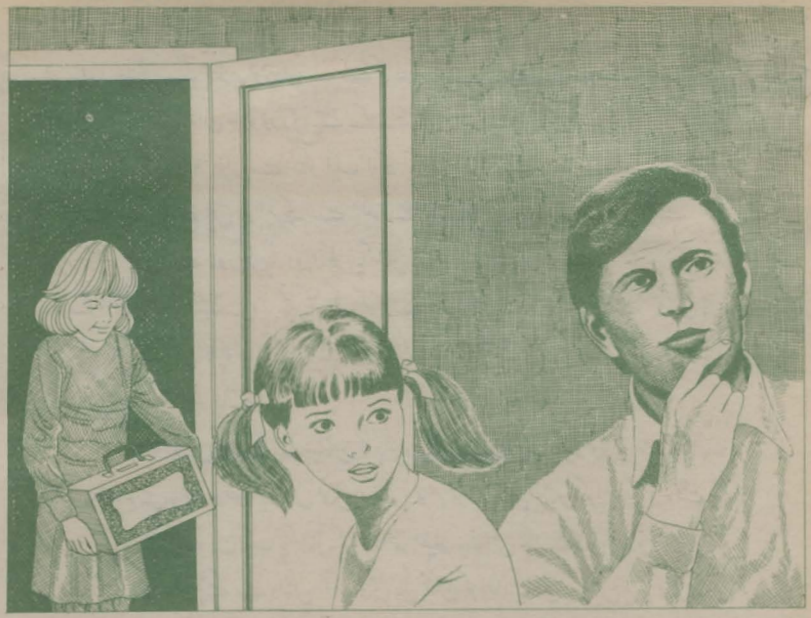

ہم نے بھی صفائی کی

صائمہ اقبال قادری

ناشتہ کرنے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے جہاں شاید ہمارے گھر والے گول میز کانفرنس میں مصروف تھے! ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ ابھی ہم صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ بھائی جان بولے "لو آگئیں کوئن آف ناکارہ" اس کے ساتھ ہی گھر والوں کا ایک قہقہہ بلند ہوا "کیا مطلب؟" ہم زور سے چیخے۔ "مطلب یہ کہ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔" دوسری طرف سے باجی کی آواز آئی۔ ابھی ہم حیران و پریشان باجی کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کے بھائی جان پھر بولے "جناب آپ کو سونے اور کھانے کے علاوہ بھی کوئی کام ہے۔" ہم جو باجی کی بات پر پہلے ہی جلے بھنے بیٹھے تھے، مزید جل کر کباب بن گئے اور غصے میں آکر اعلان کر دیا کے آج گھر کی صفائی ہم کریں گے۔ یہ

سنناتھا کہ سب لوگ ہماری طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے ہمارے سر سے سینگ غائب ہو گئے اوہ معاف کیجئے گا سینگ نکل آئے ہوں۔ خیر ہم سب کی نظروں کو نظر انداز کر کے ڈرائنگ روم سے باہر آگئے اور سب سے پہلے باورچی خانے کی صفائی کرنے کا سوچا اور یا اللہ مدد کا نعرہ لگاتے ہوئے باورچی خانے میں پہنچے لیکن یہ کیا یہاں تو ہر چیز بکھری پڑی تھی۔خیر سب سے پہلے ہم نے برتنوں کی الماری کو صاف کرنے کا سوچا۔ہم نے الماری سے سارے برتن نکالے اور انہیں جھاڑ جھاڑ کر الماری میں سیٹ کر کے رکھنے لگے لیکن نجانے کہاں سے ایک لال بیگ نکل آیا اور ہم اپنے آگے رکھے ہوئے ٹی سیٹ کی پرواہ کئے بغیر بھاگے جس سے بیچارے دو تین کپ شہید ہو گئے۔اس کے بعد بڑی مشکل سے ہم نے لال بیگ کو مارا اور جلدی جلدی ٹوٹے ہوئے کپوں کے ٹکڑوں کو سمیٹنے لگے۔ ابھی ہم ٹکڑوں کو سمیٹ ہی رہے تھے کے پاؤں پر ہمیں نرم نرم چیز کا احساس ہوا۔ہم گھبرا کر پیچھے مڑے اور زور سے پاؤں کو جھٹکا دیا جس سے پیچھے رکھے ہوئے چولھے پر رکھا ہوا سارا گرم گرم دودھ ہمارے پاؤں پر آگرا اور ہم ہائے ہائے کرتے ہی رہ گئے۔ جب نیچے دیکھا تو نرم نرم چیز وہ کپڑا تھا جس سے ہم برتن صاف کر رہے تھے۔اب ہم نے باورچی خانے پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی تو ہاتھوں سے طوطے کبوتر چڑیاں سبھی کچھ اڑ گئے۔ایک طرف دودھ کی پتیلی الٹی پڑی تھی تو دوسری طرف برتن ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ آخر ہم نے گھر والوں کے ڈر سے جلدی جلدی سب کچھ سمیٹا اور باورچی خانے سے باہر نکلے اور صحن کی صفائی کا ارادہ کیا سب سے پہلے مرغی کے دڑبے کی صفائی کرنے لگے۔ جیسے ہی ہم نے مرغی کا دڑبہ کھولا مرغیوں نے ایک دم ہم پر حملہ کر دیا۔خیر بڑی مشکل سے ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور صفائی کرنے لگے۔دڑبے کی صفائی کرنے کے بعد اب مرغیوں اور چوزوں کو دڑبے میں ڈالنے کی باری آئی۔ اب جو ہم نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی تو ساری مرغیاں غائب تھیں۔ بڑی مشکل سے دو مرغیوں کو تخت کے نیچے سے نکالا اور جب تیسری کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ہماری دادی اماں کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے ساتھ اس کے چوزے پیچھے بھاگے۔

اب حال یہ تھا کہ آگے آگے مرغی اور پیچھے پیچھے ہم۔ آخر دادی اماں کے کمرے میں جا کر ہم نے مرغی کو پکڑ ہی لیا لیکن جیسے ہی ہم نے مرغی کو پکڑا ویسے ہی ہمارا پاؤں تخت سے ٹکرایا اور ہم چاروں شانے چت نیچے گر پڑے اور ہمارے ساتھ ہی دادی اماں کا پاندان جو کہ تخت کے نیچے بڑے آرام سے تشریف فرما تھا دھکا لگنے سے گر گیا اور سارا کتھا چونا

سفید چاندنی پر پھیل گیا۔ اتنی چوٹوں کے باوجود ہم دادی اماں کے ڈر سے جلدی سے اٹھے اور سب چیزیں اکٹھی کرنے لگے لیکن شاید آج ہماری قسمت میں پٹائی لکھ دی گئی تھی۔

دادی اماں نے اپنے کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازیں سنیں تو فوراً کمرے کی طرف آئیں۔اس وقت تک مرغی اور چوزے سفید چاندنی پر کتھے اور چونے سے بڑے خوبصورت بیل بوٹے بنا چکے تھے۔دادی اماں نے جب اپنے کمرے کا یہ حال دیکھا تو اپنی چپل لے کر ہماری طرف لپکیں۔ہم فوراً ڈرائنگ روم کی طرف بھاگے۔دادی اماں بھی ہمارے پیچھے آئیں۔ ڈرائنگ روم میں جا کر جو ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دادی اماں سمیت تمام گھر والے خونخوار نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔ہم نے آگے بڑھنا چاہا لیکن میز سے ٹکرا کر نیچے گر گئے۔ اس کے ساتھ میز پر رکھا ہوا قیمتی گلدان بھی نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا۔گھر والوں نے جب یہ حال دیکھا تو جوتے چپل ڈنڈے لے کر ہماری طرف بڑھے۔اب تو ہمیں دن میں تارے نظر آنے لگے اور ہم نے بے ہوش ہونے میں عافیت جانی اور کھٹ سے بے ہوش ہو گئے۔

اقوال زریں

مرسلہ..... جان محمد، کراچی

☐ ..... قیامت کے دن غریب ہمسایہ امیر ہمسایہ کے دامن گیر ہو گا۔
(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

☐ ..... جو اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان کر دے گا۔
(ارشاد باری تعالیٰ)

☐ ..... تعجب اس پر جو جنت پر ایمان رکھتا ہے پھر دنیا کے ساتھ آرام پکڑتا ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

☐ ..... اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔
(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)

☐ ..... بُری عادت ایک زور آور دشمن ہے۔
(حضرت علیؓ)

پاکستانی شاہین

مرسلہ: سیّد محمد عمران ہاشمی

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کی چھوٹی سی فضائی فوج نے اپنے سے کئی گنا طاقت ور ہندوستانی فضائی بیڑے کے مقابلے میں جو شاندار کامیابیاں حاصل کی ان کی مثال فضائی معرکوں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ ہمارے شاہیں صفت ہوابازوں کی کامیابیوں کا سبب ان کا جذبۂ جہاد تھا۔ یہاں میں جذبۂ جہاد سے معمور ایک پاکستانی شاہین کا کارنامہ بیان کروں گا۔

۶ ستمبر ۱۹۵۶ء کی جنگ کی چوتھی رات کو فلائٹ لیفٹننٹ یونس حسن نے اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈے کا رخ کیا۔ دشمن کے ہوائی جہاز ان کا پیچھا کر رہے تھے یونس حسن نے اس جنگ میں دشمن کا بے حد نقصان کیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں اس دلیر ہواباز نے غوطے لگا لگا کر دشمن کے ہوائی اڈے پر متعدد حملے کئے۔ آخر کار گولیاں لگنے سے ان کا طیارہ آگ کی لپیٹ میں آگیا اور وہ خود بھی شدید زخمی ہو گئے۔ زخمی ہو جانے کے بعد یونس حسن نے اپنے مرکز پیغام بھیجا کہ "میرے ہوائی جہاز کو آگ لگ چلی ہے اور میں خود بھی شدید زخمی ہو چکا ہوں اگر کوشش کروں تو چھتری سے اتر کر جان بچا سکتا ہوں۔" مرکز نے ہدایت کی "فوراً نیچے اترنے کی کوشش کرو اور اپنے آپ کو بچاؤ۔" لیکن یونس حسن نے جب پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈے پر دشمن کے بمبار جہازوں کو حملے کے لئے تیار پایا تو خیال کیا کہ یہ جہاز تھوڑی دیر میں یہاں سے اڑیں گے اور پاکستانی عوام پر بم برسائیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اپنے جہاز کا رخ نیچے زمین کی طرف موڑ دیا اور مرکز کو آخری پیغام بھیجا۔ "مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے ہوائی جہاز سمیت دشمن کے اڈے پر کھڑے ہوائی جہازوں کے ساتھ ٹکرا جاؤں۔"

اس پیغام کے بعد وہ شاہین کی طرح جھپٹے ان کا جہاز زبردست دھماکے سے دشمن

کے ہوائی اڈے پر کھڑے ہوائی جہازوں کے ساتھ ٹکرا گیا تھا دشمن کے جہازوں کے پرخچے اڑ گئے پیٹرول کو آگ لگ گئی اور ہوائی اڈہ جل کر راکھ ہو گیا۔ پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈے کی تباہی سے بھارت کو معلوم ہو گیا کہ جس ملک کے نوجوان اس قدر جانباز اور دلیر ہوں اس سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس بے مثال جرات کے صلے میں خواجہ یونس حسن (شہید) کو "ستارہ جرات" کا اعزاز دیا گیا۔

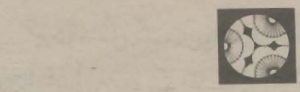

سات کلیاں

مرسلہ: اے ڈی عندلیب، منڈی مدرسہ

۱۔ تینوں پر ایمان رکھیں۔
اللہ ...... رسولؐ ...... قیامت۔

۲۔ تینوں کو ہمیشہ یاد رکھیں۔
نصیحت ...... احسان ...... موت۔

۳۔ تینوں کا احترام کریں۔
والدین ...... استاد ...... قانون۔

۴۔ تینوں کا ہمیشہ خیال رکھیں۔
وقت ...... صحت ...... مستقبل۔

۵۔ تینوں کے لئے لڑیں۔
قوم ...... ملک ...... حق۔

۶۔ تینوں کو عزیز رکھیں۔
ایمان ...... سچائی ...... نیکی۔

۷۔ تینوں پر قابو رکھیں۔
غصہ ...... زبان ...... نفس۔

ٹیپو سلطان
شیرِ میسور

مرسلہ: اسماء لغاری رحیم یار خان

ٹیپو سلطان اپنے باپ حیدر علی کی وفات کے بعد ۱۷۸۲ء میں میسور کے تخت پر بیٹھا۔ ٹیپو سلطان اسلام کا پروانہ، آزادی کی روح پھونکنے والا، مردہ دلوں کو زندگی بخشنے والا مجاہد تھا۔ اس نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان جنگ میں ایسی بہادری دکھائی کہ انگریزوں کے دل دہل گئے بظاہر انگریز ٹیپو سلطان سے بہت ڈرتے تھے۔ لیکن خفیہ طور پر سلطان کے خلاف سازشوں کا جال بچھا کر سلطان کی فوج کے بڑے بڑے افسروں کو غداری کے جال میں پھنسا دیا ان غداروں میں میر صادق، میر غلام نبی، قمر الدین اور سلطان کا دیوان پونا سرِ فہرست ہیں۔ سلطان حکمران تھا اس نے انگریزوں کے مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر انگریزوں نے ریاست پر تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ سلطان کو مجبوراً قلعۂ میسور میں محصور ہونا پڑا تیسرے روز شیرِ میسور اپنی تلوار سونت کر میدان جنگ میں آگیا، بہادری سے لڑا اور اپنی فوج کی ہمت بڑھاتا رہا اور جب زخموں سے چور ہو گیا تو پلٹ کر قلعے میں داخل ہونا چاہا لیکن نمک حراموں نے قلعے کا صدر دروازہ بند کر دیا اس پر سلطان کے سپاہیوں نے گھبرا کر ٹیپو سلطان سے کہا کہ وہ خود کو انگریز فوج کے حوالے کر دے تاکہ اس کی جان بچ جائے، لیکن ٹیپو سلطان نے کڑک کر کہا "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے" یہ کہہ کر سلطان بہادری سے لڑا اور لڑتے لڑتے وطن پر قربان ہو گیا۔

شیرِ میسور ٹیپو سلطان نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو شہادت پائی اور اپنے قول کو سچ ثابت کر دکھایا۔

کھلاڑی

کاشف اظہار

جی ہاں! کھلاڑی مگر یہ کھلاڑی کسی کرکٹ یا ہاکی ٹیم کے نہیں بلکہ قریب ہی موجود ہیں۔ اگر آپ نے شرٹ یا قمیص پہن رکھی ہو تو یہ کھلاڑی اس پر بھی عیاں ہوں گے۔ جی ہاں! یہ آپکی قمیص کے بٹن ہیں۔ ہر بٹن اپنی الگ تاریخ رکھتا ہے۔ سب سے اوپر جو بٹن آپکو نظر آئے گا اسکی تاریخ سب سے پرانی ہے۔ اسکا اصل مقصد بندے کا معقول نظر آنا بیان کیا جاتا ہے۔ تجربات سے ثابت ہے کہ یہ "بو" لگانے میں بھی مدد گار ثابت ہوتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ ٹائی بھی اسکے بغیر لگانی ممکن نہیں۔ یقیناً اسکے چند اور مقاصد بھی ہیں مگر ہمارے کلاس ٹیچر کے مطابق اسکا اصل مقصد شاگردوں کو سزا دینا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی لڑکا شرارت کرتا ہے تو ہمارے سر اسے کالر کا بٹن بند کرنے کو کہتے ہیں۔ یقین جانئے اگر شرٹ دھوبی کے ہاتھ سے ہو آئی ہو تو مجرم جلد ہی سر سے معافی مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ (کیونکہ دھوبی کے ہاں جانے کے بعد بٹن شہید ہو جاتے ہیں)

اب ہو جائے ذرا نیچے کا سفر..... دوسرے نمبر پر نظر آنے والا بٹن بھی سو داستانیں رکھتا ہے۔ یہ بٹن انسان کی فطرت، عادت غرضیکہ وہ سب کچھ بتا دیتا ہے جو پوچھنا ممکن نہیں ہوتا۔ شریفوں کا یہ بٹن بند ملتا ہے، کھلا رکھنا غنڈوں کا ٹریڈ مارک سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے استاد صاحب بٹن کی حالت یا غیر موجودگی دیکھ کر اندازہ لگا لیا کرتے ہیں کہ لڑکا لڑکر آرہا ہے۔

ان سے نیچے کے کھلاڑی صرف فیلڈ کے لئے ہیں ان کا ٹیکنیکل کام کوئی نہیں ہے۔

بازوں کے کناروں پر اور انگلیوں سے ذرا اوپر آپ کو دو کھلاڑی مزید ملیں گے۔ ایک وقت میں ایک کھلاڑی ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دو بٹن کف کو کھلا یا تنگ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں مگر یہ خوبصورتی کے لئے بھی لگائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ دونوں یا ایک غیر حاضر ہوتا ہے دونوں کی غیر موجودگی میں کفلنگ استعمال کی جاتی ہے یا قمیص کی آستین آدھی ہوتی ہیں۔

جہاں گیارہ کھلاڑیوں کا ذکر ہو وہاں بارہویں کھلاڑی کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔ یہ ریڈی میڈ شرٹوں کی اندرونی سطح پر دستیاب ہوتا ہے۔ کسی بھی پلے انگ کھلاڑی کے زخمی یا گم ہونے کی صورت میں آپ کی خدمت کرتا ہے۔

وکٹ کیپر صاحب کو اپنی جیب پر بیٹھا دیکھ کر برا مت منائیے گا۔ ان کھلاڑیوں کی حفاظت کیجئے گا ایسا نہ ہو کہ امی یا باجی جان سے ڈانٹ سننی پڑے۔

مختلف ممالک کے دارالخلافے۔ کرنسی اور اوقات

جب پاکستان (اسلام آباد) میں دوپہر کے بارہ بجے ہوں تو دنیا کے مختلف ممالک میں حسبِ ذیل اوقات ہونگے۔

ملک	دارالخلافہ	کرنسی	وقت
پاکستان	اسلام آباد	روپیہ	۱۲ بجے دوپہر
افغانستان	کابل	افغانی	۱۱½ بجے دوپہر
ایران	تہران	ریال	۱۰½ بجے صبح
اٹلی	روم	لیرا	۸ بجے صبح
انڈونیشیا	جکارتہ	روپیہ	۲½ بجے دوپہر
آسٹریلیا	کنبرا	ڈالر	۵ بجے شام
بھارت	نیو دہلی	روپیہ	۱۲½ بجے دوپہر

گلاب کا پھول

مرسلہ: ضیغم حمیدی، کراچی

گل ہے گلاب پیارا
آنکھوں کی سب کا تارا

خوشبوئے جان فزا سے
مہکا چمن ہے سارا

ہر پنکھڑی نرالی
کیا خوب ہے نظارا

باغِ فلک کا گویا
روشن سا اک ستارا

شانِ خدا سے پر ہے
یہ سُرخ سا پٹارا

دے کے گلوں کی شاہی
اللہ نے اتارا

اک بار جو بھی دیکھے
دیکھے اسے دوبارہ

شاخِ شجر پہ جیسے
رکھا ہوا شرارا

کانٹوں کے ساتھ مل کر
رہتا ہے یہ بچارا

آتا ہے اس کو کرنا
ہر حال میں گزارا

ضیغم ہوا لو رخصت
حافظ خدا تمہارا

ساتھی بچپن کے

نیاض احمد انیس ۱۵سال دہم
انگلش ڈاکٹر گورنمنٹ مسلم اسکول
جستارہ ٹاؤن ، میاں چنوں

وحید ثاقب ۱۵برس دسویں
عربی ڈاکٹر دھنوٹ
ریاض آباد ، دھنوٹ

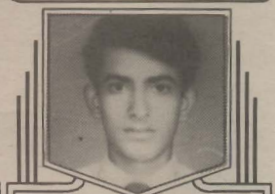

صفی الدین ۱۶سال گیارہویں
حساب ایم بی اے سول لائنز کالج
۹/۲۶۲۵ بی الرحمٰن کالونی نشتر روڈ ، ملتان

چوہدری محمد خورشید دس سال ششم
اسلامیات فوجی گورنمنٹ فاضل ہائی
قریش آباد مکان نمبر ۳ احمد پور شرقیہ بہاولپور

محمد قاسم ۱۳سال ہفتم
انگلش فوجی آفیسر گورنمنٹ اسلامیہ
رحمان برادر ، کشیدہ کاری بازار

سلمان مجید ۱۶سال گیارہویں
فزکس کمپیوٹر انجنیئر
مکان ۳۴۴/ڈی یونٹ ۲ لطیف آباد حیدر آباد

محمد آفتاب احمد ۱۷سال دہم
اسکاؤٹنگ ، کرکٹ شہریت
سیکٹر ۱۵/ڈی مکان ۱۴۹ کے تھورانی گوٹھ اورنگی

عظیم مغل ۱۱سال ششم
حساب فوجی ماڈل اسکول
پرانی وحدت کالونی ۶۸ - بی ، حیدر آباد

مبشر علی زیدی ۱۷سال بارہویں
معاشیات رائٹر جناح کالج
آر ۶۱۶ بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا کراچی

شیراز گلگتی ۱۳سال آٹھویں
انگلش سی ایس ایس کیڈٹ کالج رزمک
کشمیر ہزارہ بیکمرز ، گلگت

وقاص شاہد ۱۶سال دہم
حساب فوجی لطیف نیازی ہیوپل
بی-۱۳۶ لطیف آباد نمبر ۷ ، حیدر آباد

سوچنے کی باتیں

مرسلہ: محمد انور ملک ڈہرکی

(۱) حیرت ہے ان پر جو اللہ کو حق سمجھتے ہیں پھر بھی غیروں کا ذکر کرتے ہیں اور ان پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(۲) حیرت ہے ان پر جو موت کو حق سمجھتے ہیں پھر بھی ہنستے رہتے ہیں۔

(۳) حیرت ہے ان پر جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں پھر بھی نفرت اور تعصب کرتے ہیں۔

(۴) حیرت ہے ان پر جو اس زمین کو اپنی ماں سمجھتے ہیں پھر بھی اس زمین پر فساد پھیلاتے رہتے ہیں۔

(۵) حیرت ہے ان پر جو اپنے آپ کو عقلمند انسان سمجھتے ہیں پھر بھی حیوانوں جیسا کام کرتے ہیں۔

(۶) حیرت ہے ان پر جو بہشت پر یقین رکھتے ہیں پھر بھی دنیا میں آرام کرتے ہیں۔

(۷) حیرت ہے ان پر جو دوزخ پر یقین رکھتے ہیں پھر بھی گناہ کرتے رہتے ہیں۔

(۸) حیرت ہے ان پر جو اللہ کی پاک کتاب کو مانتے ہیں پھر بھی اس کی تعلیم حاصل نہیں کرتے ہیں۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام ________ عُمر ________

کلاس ________ پسندیدہ مضمون ________

مستقبل کا خواب ________

اسکول ________

گھر کا پتہ ________

تصویر اس سائز میں ہو!

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) ________

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ________

رقم ________ بذریعہ ________

پتہ ________

____

فون نمبر ________

اسے پلو سے باندھ لیجیے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

* ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
* ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
* ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔
* ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
* ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے سبزیاں شوق سے کھائیے ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبود اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

"جب سے میں
معیار بناسپتی میں کھانے پکارہی ہوں
میرے بچّے کھانا بڑے شوق
سے کھاتے ہیں!"
ٹی وی آرٹسٹ لیلیٰ زبیری کہتی ہیں
معیار
بناسپتی
صحت، توانائی، لذّت کا معیار
معیار بناسپتی سے برقرار
عام بناسپتی سے قیمت صرف تھوڑی زیادہ
مگر معیار بناسپتی کوالٹی میں بہت بہتر!
حبیب آئل ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
D-38 ایس، آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی فون، 292006-292926

REGD. No. M-266 SEPTEMBER 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

Colorscan